

# **DAMAGE BOOK**

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_222271**

UNIVERSAL  
LIBRARY

1602A 1915  
17574  
C. J. ...  
C. J. ...  
1915

12

**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. 1202A 1915 2222 Accession No. 1202A

Author - 0-5 Galois 17578

Title Galois

This book should be returned on or before the date last marked below.

---



# نئی بیماری

ہندراتھ

عبدالحق اکبر ٹیپمی

اشامت منزل - اردوگلی - جیدر آباد دکن

---

۱۷۵۷۸

جملہ حقوق و ائمی بحق عبدالحق اکبریدی محفوظ ہیں

تعداد طبع  
( ۱۵۰۰ )

دسمبر ۱۹۳۵ء

قیمت  
( ۱۰۰ )  
۱۲

---

# فہرست امین

صفحہ

۹	..... نئی بیماری	(۱)
۳۳	..... برف	(۲)
۶۱	..... وحشی	(۳)
۸۳	..... ہمالیہ کی چوٹی	(۴)
۹۵	..... دلہن	(۵)
۱۲۶	..... شادی کے بعد	(۶)
۱۳۵	..... دیوار	(۷)
۱۶۵	..... میری آواز	(۸)
۱۶۹	..... کاش وہ بیوقوف ہوتا	(۹)



# پڑھنے والوں سے

چمنستان اردو میں جو غچے پھول بن کر مسکرائے، اور جن کی  
ہنک نے مشامِ جاں کو معطر کیا ان میں سے ایک ہندرناتھ بھی  
ہیں، دورِ حاضر کے ادیبوں میں وہ ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں  
ہندرناتھ کے آرٹ کا سب سے بڑا کمال، مشاہدے کی  
گہرائی، اندازِ بیان کی لطافت، اور پلاٹ کی حسین و جمیل ندرت  
ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے ان کی کہانیوں  
میں فکر کی بلندی، تخیل کی رنگینی، زبان کی چاشنی کا ایسا  
ایسا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے جو اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کیے  
بغیر نہیں چھوڑتا، وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے اُن حقائق کو  
پیش کرتے ہیں کہ جن کی طرف سے انسان نے آنکھیں بند کر رکھی

ہیں، سوہ اپنے ادب میں سماج اور معاشرت کے اُن ناسوروں کو چھیڑتے ہوئے گھر جاتے ہیں کہ جو انسانیت کے لیے بدنام و مہذبہ ہیں۔ ادارہ عبدالحق اکیڈمی اس بلند پایہ ادیب کے نوافسانوں کو اس مجموعہ صورت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے، یوں تو اچھوتی فن کاری اور وسیلے الفاظ کا استعمال ہنڈر کے ادب کی جان ہے، لیکن یہ افسانے ادب اردو کے گوہر گراں مایہ ہیں۔ کیونکہ ان میں مصنف کی تخیل بالکل انفرادی اور انوکھی ہے۔

عبدالحق اکیڈمی کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ وہ آپ کے سامنے اچھے ادیبوں، بلند پایہ مفکروں کے ایسے ادب و فکر کو پیش کرے جو بلند سے بلند تر ہو، خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ سعی ملک میں مشکور ہوئی اور اہل نظر نے ہماری مطبوعات کو پسند فرمایا اور خصوصاً سے ہماری کتابیں ادبی حلقوں میں پسندیدگی نظروں سے دکھی گئیں، زیر نظر کتاب بھی ہماری مطبوعات میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قارئین بھی اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں گے۔

علی شبر جاتمی

---

میں تمہاری

---



تکارگی کی خوابیدہ آنکھوں میں گزری ہوئی رات کی  
تصویریں اچھلنے لگیں، کاسج کے چھوٹے چھوٹے گلاس جاپانی کھلونوں  
کی طرح ناچنے لگے، رنگین میز جس کا ہلکا آسمانی رنگ بال روم کی  
دیواروں سے ملتا تھا۔ اُس کی نیلگوں آنکھوں میں سمانے لگا، کہنیوں  
کو نہایت احتیاط سے میز پر رکھنا اور کچھ جھکے جھکے رہنا اور برقی  
پاش اور آرزومند نگاہوں سے امجد کو دیکھنا۔ پیرا ایک اور  
"گماٹ" لاؤ۔ مت پیو کارگی، اور پھر امجد کا اُس کی طرف دیکھنا  
حسین، جوان، خوب صورت، آنکھوں میں شباب کا نشہ جیسے  
کتنے ہی گلتا پی لیے ہوں۔ دیر تک اُس کی نشلی، رَس بھری  
نظروں کی طرف دیکھتے رہنا۔ یہاں تک کہ سارے جسم میں کپکپی

دوڑ جاتی، آنکھیں، ناک اور کان سُرخ ہو جاتے، اور پھر گارگی محسوس کرتی، کہ اُس کا جسم گرمی سے انگارہ ہو رہا ہے، اور رخساروں میں سے چیزگاریاں نکل رہی ہیں۔ بیرا۔ پانی کا ایک گلاس! گارگی گالوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی، پانی کے مردِ قطرے اُس کی روح کو تسکین بخشتے۔ لیکن پھر کسی کی شہد کی کئی سی میٹھی سانس اُس کے نتھنوں سے ٹکراتی، اور کسی کی لذت بھری آواز اُس کے کانوں میں آتی، ایک پیگ اور مائی ڈرلنگ کا بیچ کے گلاسوں کا آہستہ سے آپس میں ٹکرانا، ایسا معلوم ہونا تھا، جیسے اُن کے ہونٹ ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں اور پھر ایک بڑھم فخر وی آواز۔۔۔ جیسے اندھیرے میں کسی کی انگلیاں سار کی تاروں سے الجھ جائیں، اور ایک مبہم، غیر فانی، لطیف نغمہ بند ہو کر رہ جائے۔ وہ نغمہ جو سر سے لے کر پاؤں تک پھیل جائے اور پھیلتا جائے اور دیر تک جسم کے مساموں میں جھنجھناتا رہے۔

یہی زندگی تھی، جسے گارگی نے اپنا لیا تھا، بال و م جس کے تصور سے دل میں نغمے بیدار ہونے لگتے ہیں، گارگی کے ذہن میں تھرکنے لگا، دھیمی دھیمی روشنی، کبھی کم اور کبھی زیادہ

بالکل اسی طرح جیسے موت ہو۔ اور کبھی زندگی اور پس منظر میں بے تھیوں کا سر پلانغمہ۔ کبھی مذہم سروں میں، اور کبھی کبھی تیز۔ اور جب موسیقی عروج پر پہنچتی، تو اُس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی، اُس کے جذبات میں ایک طوفان آجاتا، صاف شفافاً بلوریں اور چمکتے ہوئے فرش پر گارگی کے خوب صورت پائل جنبش کرتے، شوخ، بھڑکیلے لباس، برہنہ ٹانگیں، گول اور گداز بازو، دیکھتے ہوئے رخسار، گملٹ کے نشے سے لبریز احرار آنکھیں، مرمیں ہاتھوں کی لرزش، مٹھی باہوں کا قہقہہ ابھرے ہوئے نقطہ۔ اور ٹھیرا ہوا، ہجوم، سانسیں آتیش، آنکھوں میں ایک پیاس ایک تشنگی، باتوں میں بے باکی، حسن کا چرچا، لبوں کی تھک گنگریا لے بالوں کا چیخ و خم اور لیک ایک ہجوم کا جنبش میں آجاتا جیسے سوئے ہوئے سمندر میں لہریں بے دار ہو جائیں جیسے کنواری لڑکی کے جسم سے کسی غیر کا ہاتھ مس ہو جائے، نائلوں کا ہلنا، پس منظر میں موسیقی کے تاروں کا لرزنا، گول گول ٹنٹنے، سفید نرم اور ملائم ایڑیوں کا ابھرنے، جیسے نوجوان لڑکیوں کو جھانک رہے ہیں، کمر میں کسی کا ہاتھ جس سے ملنے کے لیے دل اکثر ترستا رہتا ہے، اور ناچنا، تھکرنا، فضا مانسوں سے بوجھل ہو رہی ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضا میں افیون کا نشہ ہے، اور یہ نشہ جسم کی نس نس میں تحلیل ہو رہا ہے، کمر کے گرد گرفت مضبوط ہو رہی ہے، 'نزدیک' — نزدیک اور نزدیک۔ یکا یک دونوں کونے منطبق ہو جاتے ہیں، 'روحوں کا ملاپ' — حیات انسانی کا معراج، 'ناچتے ناچتے تھک جانا، تھکر تھکر کر چور ہو جانا کسی کی مدغم، سر ملی آواز کانوں کے ریشمی پردوں سے ہم آہنگ ہے، ہاتھ ابھی تک کمر کے گرد، انسان کا ازلی ہاتھ، عورت کی ازلی کمر کے گرد۔ گارگی (Garagi) اور آواز مدغم ہوتی جاتی ہے، حتیٰ کہ سائی نہیں دیتی، 'ناچتے ناچتے اعضا ڈھیلے ہو جاتے ہیں، جیسے پیٹنگ کی ڈور سے ماتھا اتر جائے، اور پھر موٹر فرائٹ بھرتی جا رہی ہے، نیم جان رات کے ٹھنڈے آنسوؤں سے گارگی کے گالوں کی حدت کم ہو جاتی ہے، سردی — — — — —  
 لحاف — — — — — گرم بستر — — — — — اور صبح۔

گارگی نے انگڑائی لی۔ اور سر کو ایک طرف جھٹک دیا۔ ریشمی بھورے بال شانوں پر بکھر گئے، پھر گارگی نے تکیے کو گول کر کے سر کے نیچے رکھا۔ اور آنکھیں کھول کر کمرے میں چاروں

لطف نگاہ دوڑائی، پلکیں نیند کے بوجھ سے کھلتی نہ تھیں، اور سر  
 میں ابھی شراب کا ہلکا ہلکا نشہ تھا، سوج کی اویس کر میں رنگین شیشوں  
 سے ٹکراتیں، اور اندر آنے کی ناکام کوشش کرتیں، گارگی نے ایک  
 جمائی لی، اور ریشمی چادر پھراڑھے لی، اُس کے جسم پر ایک پتلی سی  
 ساڑھی تھی۔ گارگی نے سوچا۔ اگر یہ ساڑھی بھی نہ ہو۔ تو پھر کیا ہوگا  
 بیڑ پر پڑا ہوا کیوٹڈ کا بت اس کی طرف مسکراتا ہوا نظر آیا۔ بت کے  
 دل کش خطوط کو دیکھ کر وہ پھر خیالات کے سمندر میں ڈوب گئی، اور  
 پیرس کی ایک رات اسکی آنکھوں میں گھوم گئی، اس رات کو وہ کبھی  
 فراموش نہیں کر سکے گی، اسی رات تو اُس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا  
 باہر سیاہ اور بھیانک رات تھی، اور بال کے اندر جگمگاہٹ —  
 روشنی، ہر طرف روشنی، زندگی، چہروں پر شگفتگی، آنکھوں میں تروتازگی  
 ہر طرف مسکراہٹیں، تہقیر — انسان ازل سے تنگ پیدا ہوا  
 ہے، پھر شرم کس بات کی، ایک آرٹسٹ نے قریب آکر کہا، پھینکٹ  
 یہ کپڑے، یہ بوسیدہ کپڑے، غلاظت اور گندگی سے اٹے ہوئے،  
 غریبوں کے خون سے لتھڑے ہوئے۔ اور وہ مسکرایا اور اُس نے  
 گارگی کی طرف دیکھا، یہ ریشمی کپڑے، یہ غازہ، یہ لب، یہ سب، یہ  
 شانوں پر بکھرے ہوئے بال، یہ سب نئی تہذیب کی زنجیریں، میں،

اتار دو، پیمینک دو، آدمی ننگا ہے، بالکل ننگا ہے، وہ ایک وحشی ہے، اور وہ اور قریب آگیا، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب یہ دنیا والوں کے قریب ہیں، یہ حکومت کرنے والوں کی چالیں ہیں، امیر کی سیاست اور غریبوں کی لوٹ ہے۔ اور وہ اور قریب آگیا، ساری کہہ رہی تھی۔ پوڈر اتر رہا تھا، ہم انسان ہیں، ہم سب انسان میں۔ اور وہ قریب آگیا۔ اُس کا سانس گارگی کے گالوں سے نِس ہو رہا تھا، اب تم غلام نہیں ہو، اب تم آزاد ہو، ہم نہ پرانی تہذیب چاہتے ہیں۔ نہ نئی تہذیب۔ ہم انسانیت چاہتے ہیں، اور وہ گارگی کے قریب بیٹھے گیا، ہم سب انسان ہیں۔ یہاں نہ کوئی امیر ہے، نہ غریب۔ ان ننگے انسانوں کو دیکھو، ان سب میں کیا فرق ہے، پھر ان کپڑوں کا کیا فائدہ، ان کپڑوں کو اتار دو، یہ ننگا آرٹ ہے، یہ ننگی تہذیب ہے، اُس نے گارگی کے اور قریب آتے ہوئے کہا، ڈر۔۔۔ شرم۔۔۔ جھمک، یہ پرانی اور نئی تہذیب کی زنجیریں ہیں۔ پرانی اور نئی زنجیروں کو توڑ دو، ہوا گرم سانسوں سے جو جہل ہو رہی تھی، روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی، سناٹا، موت، تاریکی۔۔۔ اور ننگی کلب۔

یورپ کی سیرگاری کو جھنگلی نہ پڑی تھی، روپیہ۔  
 بافراط ملتا تھا۔ جس سمت اُس کا ذہن جاتا وہ بغیر کسی نہ شے  
 کے اسی سمت چلی جاتی، یورپ میں رہ کر اُس کی اخلاقی قدریا  
 کم زور پڑ گئی تھیں، یا یوں کہیے، کہ اخلاقی قدروں کا نشان ہی  
 ذہن سے اٹھ گیا تھا، اب گارگی کا واپس ہندوستان جانے کو  
 جی نہیں چاہتا تھا، اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے لیے حالات  
 سازگار نہ ہوں گے۔ اگر اُس نے اس ماحول سے بغاوت  
 کرنے کی کوشش کی، تو کہاں تک کامیاب ہو سکے گی، اب یہاں  
 کیا کرے رہ کر۔ شباب کا اولین باب پیرس کی ننگی کلب میں  
 ختم ہو گیا، اور اگر وہ یوں ہی کسی کے ساتھ چپک جانے کی  
 کوشش کرے تو کچھ عرصے کے بعد گھر سے روپیہ آنا بند ہو جائے گا،  
 اور شباب کا بچا کھچا سرمایہ ان لوگوں کے نذر ہو جائے گا، پھر  
 وہ کیا کرے گی۔ گارگی نے سوچ بچار کر تہیہ کر لیا، کہ اُسے واپس  
 گھر جانا چاہیے، اُس نے ایک صبح واپس جانے کی تیاری کرنی  
 اور ایک حسرت بھری نظر یورپ کے اوجھل ہوتے ہوئے ساحل  
 پر ڈالی، چند دنوں کے بعد گارگی گھر آگئی، والدین کی نکلا ہوں  
 میں گارگی ابھی بچہ ہی تھی، اور والدین کو اس بات کا خواب نہ لیا

ہی نہ تھا، کہ ان کی چہیتی لڑکی زندگی کا بہترین سرمایہ یورپ کی نذر کر چکی ہے، لیکن ان کی لڑکی کی صحت پہلے سے بہتر تھی، گارگی پہلے کی یہ نسبت فریہ اندام ہو گئی تھی، گو وہ اتنی شوخ اور چپخل نہ رہی تھی اور نہ ہی وہ اب لہلہ کی گود میں کھیل سکتی تھی، اب وہ ایک عورت تھی، نگارگی کو اب بھی خوشنما کپڑوں کے پہننے کا شوق تھا، وہ بھر کیلے چمکیلے لباس بہت پسند کرتی تھی، چہرے کی خوب صورتی برقرار رکھنے کے لیے سوجن کرتی، پوڈر، غازد، لپ شک، کا بدستور استعمال کیا جاتا تھا، نگارگی اب زیادہ بے باک ہو گئی تھی، اُسے اپنے دوستوں کی آراء کا بہت خیال رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا، اور رنگوں کے امتزاج کا اُسے بہت سلیقہ تھا، وہ اکثر رات کے بارہ بجے کے بعد ہی گھڑ آتی تھی۔ ڈنر، بال روم، سینما، کلب وغیرہ میں اس کا زیادہ وقت صرف ہوتا تھا، اور گھر میں دوستوں، عاشقوں اور بڑا حوں کا ایک تاننا بندھا رہتا۔

گھر والوں نے تنگ آ کر نگارگی کی شادی ڈاکٹر شرما سے کر دی، ڈاکٹر شرما شہر کے مشہور ڈاکٹروں میں سے تھے۔ اُن کی پریکٹس خوب چلتی تھی، لاکھوں کے مالک تھے۔ انھوں نے بھی

یورپ کی خوب سیر کی تھی، گو ڈاکٹر شرما خوب صورت نہ تھے، لیکن انھیں بد صورت بھی نہیں کہا جاسکتا، روپے کی فراوانی انسان کی بہت سی کم زوریاں چھپا دیتی ہے، پہلے تو گارگی نے حیل و حجت کی، لیکن پھر ڈاکٹر شرما سے شادی کر لی، شادی کے بعد گارگی نے محسوس کیا کہ وہ اپنے خاوند پر اچھی طرح رعب گانٹھ سکتی ہے۔ شروع شروع میں ڈاکٹر شرما نے گارگی کو ایک دو بار ٹوکا، پھر گھر میں لڑائی جھگڑے بھی ہوئے، لیکن سب بے سود۔ اور یکا یک ڈاکٹر شرما نے گارگی کو سمجھانا چھوڑ دیا، وہ وقت پر گھر آتا، کھانا کھاتا اور پھر چلا جاتا، گارگی کو روپے کی قلت نہ تھی، وہ جو کچھ چاہتی اپنے خاوند سے مانگ لیتی تھی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ڈاکٹر شرما کی بیوی ہے۔ اور اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خاوند کی کمائی میں سے اپنا حصہ، جس طرح بھی چاہے، خرچ کرے، شروع شروع میں گارگی نے اپنے شوہر کو اپنے ساتھ بال روم میں لے جانے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی، ایک دو بار دونوں رستوران میں اکٹھے گئے، اور گارگی نے اُسے کاک ٹیل پینے کے لیے کہا، لیکن شرما صاحب نے پینے سے انکار کر دیا۔

اکثر گارگی اپنے شوہر سے پوچھتی۔

”آپ شراب کیوں نہیں پیتے۔“

”مجھے کچھ لطف نہیں آتا۔“

”کیا آپ نے کبھی شراب پی ہی نہیں۔“

”کیوں نہیں۔“

”اوہ۔“

”کتنی بار۔“

”مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”کیا آپ اب شراب پینا گناہ سمجھتے ہیں۔“

”بالکل نہیں۔“

نگارگی یہ سن کر چپ ہو جاتی، اور دل ہی دل میں

کڑھتی۔ اور پھر سوال کرتی۔

”آپ میرے ساتھ ڈانس نہیں کرتے۔“

”میں ڈانس کرنا جانتا ہی نہیں۔“

”کیا آپ نے لندن میں کبھی کسی لڑکی کے ساتھ

ڈانس نہیں کیا۔“ پھر زبردست مسکراتی۔

”مجھے یاد نہیں۔“

”کیا آپ کو تاج سے نفرت ہے۔“

”بالکل نہیں“

”تو آپ ڈانس سیکھ کیوں نہیں لیتے“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا“

”آپ بہت ضدی ہیں“

اور پھر دونوں رسٹوران سے باہر نکل کر گھر کی جانب

رخ کرتے۔

اور اس طرح گارگی اور شرما ایک دوسرے سے

دور ہوتے گئے، شروع میں گارگی کو کچھ برا محسوس ہوا۔

لیکن ملاحوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اُسے اپنے

خاوند کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

اعجد، رمیش، پرکاش اور شیام اُس کی شاموں

کو رنگین بنا دیتے، یہ لوگ بھی سوسائٹی کے اس طبقے سے تعلق

رکھتے تھے، جہاں روپیہ بافراط ہوتا ہے، ماں باپ لاکھوں کے مالک

ہوتے ہیں، اور سوائے اس کے کہ یہ لوگ روپے صرف کرنے

کے مختلف ذرائع تلاش کریں، ان کا کوئی اور مشغلہ نہ تھا، برج،

فلیش ریس، سوسائٹی گرلز، اینگلو انڈین یا پارسی لڑکیوں سے ملنا

اُن سے باتیں کرنا، اُن سے فلرٹ کرنا، اور خوب جی بھر کر شراب

اور بیرپینا ہی ان کا کام تھا، جب کبھی کلب میں کوئی نیا چہرہ آتا تو یہ لوگ جلد ہی اس سے واقفیت پیدا کرتے، اُس کے گھر آنا جانا شروع کر دیتے، اُسے اپنے گھر بلاتے، کبھی چائے پر کبھی کھانے پر، شام کو سینہ لے جاتے، رات کلب میں گزرتی، اور اس طرح نئی لڑکی اُن سے بے تکلف ہو جاتی، اور جب مگارگی کلب کی ممبر بنی تو ان لوگوں نے مگارگی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے، مگارگی پہلے ہی ان باتوں میں ہوشیار تھی، وہ خود ایک تجربہ کار فلرٹ تھی اور اس فن کی ماہر تھی۔ اُس کی گھریلو زندگی اتنی خوش گوار نہ تھی اور اگر گھریلو زندگی خوش گوار بھی ہوتی۔ تب بھی وہ ان باتوں سے کب باز آتی، اسے ان باتوں کا چسکا لگ چکا تھا۔ وہ زندگی کی رنگینیوں سے واقف ہو چکی تھی، اس لیے اُسے اس ماحول سے مانوس ہونے میں کوئی خاص دقت محسوس نہ ہوئی۔ اجمد رومیش، پرکاش اور شیانم سب لوگوں نے باری باری مگارگی کو اپنانا چاہا۔ یہ یار لوگ آپس میں اتنے بے تکلف تھے، کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی باتیں بتا دیتے تھے، اکثر وہ اکٹھے بیٹھتے، اور مگارگی کے متعلق گفتگو کرتے۔

”بھئی بڑی چالاک عورت ہے۔“

”کتنی ذہین ہے گارگی۔ کیوں اجمد۔“  
 ”ذہانت پر خاک ڈالو، حسین کتنی ہے بیٹا، اُسے  
 دیکھ کر دل اپنی جگہ پر نہیں رہتا۔“

”دو سال پیس میں رہی ہے، میرے دوست۔“  
 ”باتوں میں کتنا رس ہے۔“

”دیکھ لو کسی کو بات نہیں کرنے دیتی، محفل پر  
 چھا جاتی ہے۔“ شام کہتا۔

”لیکن فراخ دل بھی تو ہے۔“ اجمد کہتا اور پھر  
 اس کی آنکھیں مسکراتیں۔

”اگر فراخ دل نہ ہوتی تو ہمارا کیا بگاڑ لیتی۔“  
 ”ایسی عورتوں کی کلب میں اشد ضرورت ہے،  
 میری جان۔“ یہ کہہ کر رومیش قبہ لگاتا، اور پھر لبوں پر زبان پھرتا  
 اور پھر یہ لوگ گارگی کے جسم کے ہر عضو کو پرکھنے  
 لگتے۔ کہ فلاں حصہ ایسا ہے، اور فلاں حصہ ویسا ہے، ان لوگوں  
 کے دلوں میں گارگی کے لیے عورت نہ تھی، یہ لوگ زندگی کے  
 اس راستے پر چل رہے تھے، جس پر گارگی کئی برسوں سے گام  
 تھی، یہ لوگ اُن بجنوروں میں سے تھے، جو ہر نئے پھول کے گرد

منڈلاتے رہتے ہیں، اور جب اُس کا رس چوس لیتے ہیں تو دوسرے پھولوں کی طرف رخ کرتے ہیں، گارگی شباب کے نشے میں اُن سنبوں سے کھیلتی رہی۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ خاوند ایسا ملا تھا، جو کبھی کچھ نہ کہتا۔ اور پھر خدا نے حسن دیا تھا، تو کیوں نہ ان باتوں کا پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے، اکثر ان لوگوں کے اظہارِ محبت کا ایک ہی طریقہ ہوتا تھا: یہی کہ پہلے کلب میں ملاقات ہوئی پھر چائے پر گھر بلایا۔ پھر کھانے پر مدعو کیا، سینہا چلے گئے۔ اور جب فلم دیکھ کر واپس آئے تو چپکے سے کمر میں ہاتھ ڈال دیا اگر عورت خاموش رہتی ہے تو بات ٹھیک ہے، گارگی کے کان ایک ہی قسم کی باتوں سے مانوس ہو چکے تھے.....

یو۔ آر۔ ونڈرفل، ڈارلنگ۔ یو۔ آر۔ سویٹ۔ تم میرے خوابوں کی ملکہ ہو، ایک جام اور.....

زندگی میں وہ دن بھی آتے ہیں، جب شباب کا سونا پگھلنے لگتا ہے، بے چاری عورت کا شباب تو اتنا دیرپا نہیں ہوتا۔ اور ان کلبوں میں سوسائٹی گرلز کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے، کیونکہ یہاں ایک شمع کے گرد بہت سے پروانے ہوتے

ہیں، اور جب کبھی کلب میں کوئی نئی شمع آتی ہے، تو پروانے پرانی شمع کو چھوڑ کر نئی شمع کے گرد لٹاف کرنے لگتے ہیں۔ گارگی اب محسوس کر رہی تھی، جب سے رکھیا نے کلب میں آنا شروع کیا تھا۔ پروانے اُسے چھوڑ رہے تھے، گو احمد، رومیش، پرکاش، اس کے پاس آتے تھے، لیکن کبھی کبھی زندگی میں وہ لطافت نہ رہی تھی، وہ ہوش و خروش، وہ ذہنی عیش، وہ قہقہے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی جگہ کچھ گھٹی گھٹی مسکراہٹیں۔ کچھ کچھ پکے وعدے، کچھ تیز اور چھینے والی باتیں، اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے، وہ پیار اور اُنس غائب۔ زندگی بے لطف اور بے جان سی ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ گارگی کو نیم شعوری طور پر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ رکھیا کے آنے سے کلب میں اُس کی وقعت کم ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھی، وہ سچی کبھی زندگی سے زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل کرنا چاہتی تھی رکھیا ایک نئی نویلی لڑکی ہے، اُس نے زندگی میں ابھی تک دیکھا ہی کیا ہے، وہ لگاوٹ کی گھاتیں نہیں جانتی۔ لیکن رکھیا کے نونیز شباب کے آگے گارگی کی جوانی نامد پر چکی تھی، پروانے رکھیا کی طرف مائل پرواز تھے اور وہ پروانوں کو اپنے قبضے میں رکھنا

چاہتی تھی، اُس لیے اُس نے اپنی زندگی سے کھیلنا شروع کیا پہلے اس کھیل میں مزہ آتا تھا، ایک قسم کی تسکین، ایک قسم کا سکون اور جب پرولنے اُس کے گرد طواف کرتے تھے تو وہ اُسے اپنی شخصی فتح تسلیم کرتی تھی، لیکن اب اس فتح میں تلخی تھی، اب گارگی ہر شخص سے بے تکلف ہو جاتی، اُس کی جائز یا ناجائز بات مان جاتی، ہر شخص سے مل کر شراب پی لیتی۔ پاؤڈر اور غازہ کا زیادہ استعمال کرنا شروع کیا، آنکھوں کو فیروہ کر دینے والے لباس سے اپنے آپ کو آراستہ کرتی۔ لیکن اس کے شباب میں اب شوخی نہ تھی، حسن میں وہ کشتش نہ تھی، خون میں وہ حدت نہ تھی، اب گارگی کچھ کرتی، تو محض اپنی کھوئی ہوئی وقعت کو برقرار رکھنے کے لیے، اُس نشے میں سرشار رہنے کے لیے، جس کے لیے اُس نے اپنی زندگی کی بازی لگا دی تھی، شاید گارگی کو اس بات کا پورے طور پر احساس نہ تھا، کہ وہ موسم بہار کی گود سے نکل کر خزاں کے پہلو میں جا بیٹھی ہے، گو اُس صبح اُسے ایک شدید دھچکا لگا، جب اُس نے دائیں کان کے ذرا اوپر ایک سفید بال دیکھا، وہ دیر تک اس سفید بال کو دیکھتی رہی، اب تو آنکھوں کے نیچے کچھ جھریاں سی پیدا ہو رہی تھیں، چہرہ بھی کمر ذرا سا ہو گیا تھا۔ کولہوں پر زیادہ گوشت

آگیا تھا۔ اور جسم کے خلوط میں وہ دل کشی اور جاذبیت نہیں رہی تھی، رومیٹس، چرکاش اور آجداب رکھیا کے گرد چکر لگا رہے تھے، دراصل گارگی کو ان لوگوں سے کوئی خاص نکاو نہ تھا، وہ بھی ایک حسین تیزی کی طرح اُن سے کھیلتی تھی لیکن شیام کو چاہتی تھی، وہ اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتی تھی، شیام کے خدو خال میں ایک عجیب قسم کی دل فریبی تھی۔ اُس کی باتوں میں لطافت تھی، روانی تھی، ان گنت باتیں، وہ اکثر اُسے *amanda* اور بے ہودہ بھی کہہ دیتا تھا، لیکن وہ ان گالیوں کو نظر انداز کر دیتی تھی، اور جب کبھی وہ شراب پی لیتا، تو وہ اُس کی گود میں سر رکھ دیتا اور نہایت بے تکلی باتیں کرتا اور پھر کہتا۔ *یو امندا یو*..... پھر اُس کے ہاتھوں کو چومتا، اُس کے بالوں سے کھیلتا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتا اور اُس کی حنائی انگلیوں کی تعریف کرتا، وہ شیام کے یشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی حتیٰ کہ شیام کو نیند آجاتی اور وہ وہیں سوئے پر سو جاتا۔

شیام کم عمر تھا، اور کلب میں نیا نیا آیا تھا۔ اُس کا مردانہ من دیکھ کر لڑکیاں اس کی طرف مائل ہوتیں، لیکن گارگی نے اُسے ابھی تک اپنے جال میں پھانس رکھا تھا، کبھی کبھی گارگی سوچتی

کہ وہ شیام سے شادی کر لے، آخر کلب میں کئی لڑکیوں نے اپنے پہلے  
 خاوندوں کو طلاق دے کر شادیاں کر لی تھیں، اُسے بھی اپنے شوہر سے  
 نفرت تھی، وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر اُسے کبھی پیار نہیں کر سکتا،  
 اور وہ زندگی کے آخری دنوں میں تنہا نہیں رہنا چاہتی تھی، کیا شیام  
 اُس سے شادی کرے گا، وہ اس بات پر غور کرنے لگی، اور پھر اُسے  
 خیال آیا کہ وہ شیام سے کیوں شادی کرے، آخر اس شادی کا مطلب  
 ہی کیا، دراصل وہ کسی کا سہارا چاہتی تھی، اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ  
 آج شیام سے شادی کے متعلق گفتگو کرے گی، اب وہ زیادہ عرصہ  
 انتظار نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر اُس نے زیادہ عرصہ  
 انتظار کیا تو شیام بھی اُس کے چنگل سے نکل کر کھینچا گاڑیہ ہو جائے گا،  
 لیکن ایسا کیوں ہو، وہ شیام سے شادی نہیں کرے گی، بلکہ اُس سے  
 یہ کہے گی، کہ وہ آج سے کسی دوسری عورت سے تعلق نہ رکھے، وہ صرف  
 اُس سے محبت کرے اور وہ زندگی بھر اُس سے محبت کرتی رہے گی  
 شادی تو اُس کی بچی تھی اب دوبارہ شادی کرنے سے کیا فائدہ، اور  
 جب دن ڈھلے شیام اُس کے پاس آیا، تو نگارگی نے خوب اُس کی  
 اُو بھگت کی، وہی پیار محبت کی باتیں۔ آج شیام چپ تھا، اُس  
 کی باتوں میں نہ وہ الحاف تھی نہ وہ شگفتگی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد

شیام اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جانے کے لیے اجازت مانگی، گکارگی حیران رہ گئی۔

”تم بیٹھتے کیوں نہیں شیام؟ آوازیں بے جا نرمی تھی۔“

”کچھ بات نہیں بنتی گکارگی۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”رکھیا نے بلایا ہے۔ رویش، امجد اور پرکاش

وہیں ہوں گے۔“

”شیام! گکارگی نے حریصانہ نظروں سے شیام کی

طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ شیام نے مکڈانی کی گرہ کو دست

کرتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“

”بہت پرانی بات ہے گکارگی۔“

”کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟“

”بہت جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔“ وہ

کوٹ کے کالریپ سے گرد جھاڑنے لگا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“  
 ”تم ہی نے تو سکھایا ہے، اچھا میں جاتا ہوں گڈباٹی“  
 ”شیام۔“ گارگی نے چیخ کر کہا، میں تم سے

شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

شیام کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی نے گارگی کو بے دست و پا کر دیا، اُس نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور شیام سے کہنے لگی۔ تکل جاؤ، کیونکہ کہیں کے، اور شیام نے ایک اور قہقہہ لگایا، اور بیڑھیوں سے نیچے اتر گیا، گارگی چپ چاپ سونے پر بیٹھ گئی، بالکل اس قمار باز کی طرح جو اپنا تمام مال و متاع لٹا چکا ہو، وہ رونا چاہتی تھی، لیکن رونہ سکی، اس کے کانوں میں مدھم لہجے میں چند الفاظ ٹکرا رہے تھے، ڈارنگ۔۔۔۔۔ ایک بیگ اور۔۔۔۔۔ بس ایک چھوٹا سا ننھا سا بیگ۔۔۔۔۔ اب یہ الفاظ کو کہے گا، وہ سوچنے لگی، لیکن بدستوریہ الفاظ اُس کے ذہن میں گشت لگا رہے تھے، کیا وہ ان لفظوں کو کبھی نہ بھول سکے گی، کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے، وہ دوڑتی ہوئی بیڑھیاں اتر گئی، سامنے باغیچے میں اُس کا شوہر بیٹھا ہوا تھا ایک سیکنڈ کے لیے وہ جھبکی، لیکن دوسرے لمحے میں وہ اپنے خاوند کے سامنے کھڑی تھی۔

”میں جانتا تھا کہ تم ایک دن میرے پاس آؤ گی۔“  
”مجھے معاف کر دو۔“

”معافی کی کوئی بات نہیں گا رگی۔“  
”کیا آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔“  
”محبت سے ابھی تک جی نہیں سیر ہوا تمہارا۔ آواز  
میں رعب اور خود اعتمادی تھی۔

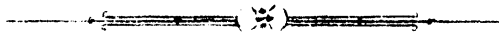
”اب مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔“ آواز میں

احساس شکست.....

”میں جانتا ہوں۔“  
”میں کہاں جا سکتی ہوں۔“  
”تم کہاں جانا چاہتی ہو۔“  
”آپ تو شاید مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔“  
”شاید۔ آخر میں بھی انسان ہوں، دیوتا تو نہیں۔

مجھے ان باتوں کا بہت رنج ہے، میرے پاس بہت مریض آتے  
ہیں، میں ان کا علاج کرتا ہوں، مجھے تمہاری بیماری کا علم تھا۔  
لیکن میں علاج کرنے سے قاصر تھا، اور اگر آج تم نے اس بیماری  
سے چھٹکارا حاصل کر لیا، تو یہ بھی میری فتح ہے۔“

اور گارگی بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس نے اپنا سر شوہر کے زانوں پر رکھ دیا، شرمانے آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں گارگی کے بالوں میں پھیرنی شروع کیں، اور یکایک مسز شرماکو محسوس ہوا کہ ان ہاتھوں کا لمس باقی ہاتھوں سے کتنا مختلف ہے، اس لمس میں کتنا خلوص ہے، کتنا پیار ہے، ایک قسم کی پدرانہ شفقت، جس کے احساس سے وہ آج تک محروم تھی۔ اس لمس میں ایک قسم کی کیفیت ہے، جو حیوانیت سے گریز کرتی ہے، آج تک وہ اس لمس سے بیگانہ تھی۔



بِسْمِ

---

---



وہ لکڑی کی کرسی پر اپنی تیلی ڈبلی ٹانگوں کو اکٹھا کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی رانیں، پیٹ سے ہم کنار ہوتی ہوئی اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، اُس نے اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر رکھتے ہوئے باہر نظر دوڑائی، آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا۔ تو وہ سردی سے مغلوب ہو کر اپنے دائیں ہاتھ کو رانوں میں دباتے ہوئے پنچ تارے کے درخت کی طرف دیکھنے لگتا۔ پنچ تارے کا درخت پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ سُرخ سُرخ پھول اُس کی آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے نظر آئے، اس ہلکی ہلکی بارش میں پنچ تارے کے پھول محبوب کے لبوں کی طرح نظر آتے۔

تھے، سرخ، تروتازہ نازک بوسوں کی نمی میں بھیگے ہوئے۔ کبھی کوئی پرندہ درخت کی نازک لہنی پر آتا اور اپنے نرم و نازک پروں کو ہلاتا ہوا، اکڑوں ہو کر بیٹھ جاتا۔ ہوا سرد تھی، ٹھنڈی اور سوج بستہ، جسم کے ہر مسام میں سرایت کر رہی تھی، وہ اُس لذیت ناک سردی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا، اس لیے وہ کرسی پر ٹانگوں کو اکٹھا کر کے اور اکڑوں ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا دایاں ہاتھ رانوں میں دبا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے سے یاسیت اور بے بسی ٹپکتی تھی، اُس کی کرسی برآمدے میں تھی، اور برآمدے کے ایک کونے میں چولہا تھا، جس میں سے بے جس بے جان سادھواں اٹھ رہا تھا، وہ دیر تک اس سیاہ دھوئیں کی طرف دیکھتا رہا۔ دھواں برآمدے میں ہی چکر لگا رہا تھا، جیسے باہر کھلی فضا میں جانے سے ڈرتا ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا بیج بستا جو نیکا ذراتیزی سے آتا تو اس کی ناک اور کان سردی سے نیلے ہو جاتے۔ اور وہ اپنے جسم کو سکیڑتا، اپنے پیٹ کو ٹانگوں سے بھینچتا۔ اور ————— ہاتھ کو گرم گرم رانوں میں دباتا ہوا سُرخ سُرخ پھولوں کی طرف دیکھنے لگتا، کبھی کبھی اس کی نگاہیں ان پھولوں سے ہٹ کر سامنے کی کھڑکی کی طرف جاتیں، اُسے

اس کھڑکی کی جانب دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ جب وہ پہلی بار اس گھر میں وارد ہوا تھا، تو اسی برآمدے میں بیٹھ کر اُس نے سرخ ہونٹوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اُن دنوں وہ اکیلا نہ تھا، بلکہ اس کی والدہ اس کے ساتھ رہتی تھی، اس کی والدہ کو یہ پسند نہ تھا۔ کہ وہ کبھی شہر کی جوان لڑکیوں کی طرف دیکھے، اور جب کبھی جوان لڑکیاں گھر میں آتیں۔ تو اس کی ماں اسے گھر سے باہر چلے جانے کو کہتی، یا وہ خود ہی دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ اس کی ماں یہ کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ کہ اس کا لڑکا کسی نوجوان لڑکی سے گفتگو کر سکے، اور لڑکیاں بھی اس کی ماں سے بہت خوف زدہ تھیں، اور جب کبھی وہ اس کی ماں سے ملنے آتیں، تو کانپتی، ڈرتی، ہنسی ہوئی گھر میں داخل ہوتیں، اکثر وہ سر ڈھانپ کر آتیں، اور ان کی نگاہیں زمین کی طرف لگی رہتی تھیں۔

اس نے آج تک کسی لڑکی کو قہقہہ لگاتے ہوئے

نہ سنا تھا، لڑکیاں ہمیشہ سرگوشیا نہ انداز میں باتیں کرتیں، وہ دل ہی دل میں اپنی ماں کو کوستا رہتا تھا۔ آخر اس کڑی نگرانی کا کیا مطلب تھا؟ لیکن وہ اپنی ماں کے خلاف کچھ نہ کہہ سکتا تھا، اور وہ کہتا بھی کیونکر۔ اس کی عمر ہی کیا تھی، یہی اٹھارہ سال، بس وہ

کالچ میں نیا داخل ہوا تھا، تو زندگی کے متعلق اس کی معلومات نہایت محدود تھیں، شاید اس کی ماں اس کے بھلے کے لیے کہتی ہو، اور یہ روک تھام، یہ کڑی نگرانی، یہ بندشیں اس کے لیے مفید ثابت ہوں، لیکن وہ اس عمر میں کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک نئی لذت سے آشنا ہو رہا تھا، وہ اپنے آپ کو کھلی فضا میں چھوڑنا چاہتا تھا، تاکہ وہ ایک پرندے کی طرح اس فضا میں اڑتا رہے۔ حتیٰ کہ اس کے پر اس اڑان سے تھک جائیں اور وہ اس ٹھکن سے چور ہو کر اس غمخیں گھاس پر لیٹ جائے، اور سوچتا رہے، کس کے متعلق یہی تو وہ سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک نئی لذت، ایک نئی مسرت، ایک نئی قوت سے دوچار ہو رہا تھا، اور جب کبھی وہ کسی جوان لڑکی کی طرف دیکھتا، تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، پھر وہ لڑکی کو دیکھ کر نثرما جاتا، جیسے وہ کسی فاش غلطی کا مرتکب ہوا ہے، اور اگر لڑکی بھی اس کی طرف دیکھ لیتی، تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگتا، اور تمام رات لڑکی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا، اکثر وہ لڑکی سے دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا، اور جب کبھی شہر کی گلیوں میں لڑکی اسے ملتی تو وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہتا۔ مگر

اس سے کچھ نہ کہہ سکتا، اور جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی، تو وہ اپنے آپ کو کونسنے لگتا۔ کہ وہ کیوں نہ اُس سے بات کر سکا۔ اکثر اسے اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا، کہ اگر اس نے کسی لڑکی کو چھیڑ دیا۔ اور لڑکی نے اس کی ماں سے شکایت کر دی، تو وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ اسی وجہ سے وہ گھٹا گھٹا سا رہتا، اور اسے ایسا محسوس ہوتا، کہ اس کے جسم کے اندر ایک طوفان بندھے، جو ربائی کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔

اور اب وہ اپنی ماں سے ۵۰۰ میل دور تھا، اس کی حرکات و سکنات اور اس کی باتوں میں خود اعتمادی آگئی تھی، وہ اب لڑکیوں کو بے باک نگاہوں سے دیکھتا تھا، اور کبھی کبھی انہیں اشارے بھی کیا کرتا، اس لڑکی کے ہونٹ کتنے سرخ تھے، جو اکثر کھڑکی کے قریب کھڑی ہوا کرتی تھی۔ وہ صبح کے وقت وہیں بال سنوارا کرتی۔ مشرق سے سورج کی نئی، تازہ کرنیں اس کے بالوں کو چومتیں، اور وہ ان لمبے لمبے تاروں کو حیرت سے دیکھا کرتا۔

کاش وہ ان بالوں کو چھو سکتا۔ اور ان کی ملائمت سے لطف اندوز ہو سکتا۔ لڑکی کے بال کتنے سیاہ تھے، جیسے

سردیوں کی راتوں کی تمام سیاہی اس کے بالوں میں جذب ہوگئی ہو، لیکن سب سے جاذب نظر چیز لڑکی کے سرخ ہونٹ تھے، وہ اکثر لڑکی کو برآمدے میں آنے کے لیے کہتا، اور لڑکی اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی، اس کی مسکراہٹ میں کتنی رونق تھی، صبح کی دھوپ میں لڑکی کے ہونٹ اور چکنے لگتے، لبوں پر اور سُرخ آجاتی، اور وہ اپنے سیاہ، ریشمی بالوں میں نہایت تیزی سے گنگمی کرنے لگتی، کبھی کبھی وہ دھیمی آواز میں گنگمانے لگتی، آواز دھیمی ہوتی تھی، نہایت ہی مدھم اور شیریں، اس لیے وہ لفظوں کا مفہوم نہ سمجھ سکتا تھا، کیا یہ ضروری تھا، کہ وہ لفظوں کے مفہوم کو سمجھ سکے، کیا آواز کی موسیقی جیسی ہوئی لڑکی کچھ کی کچھ دہنی ہوئی، خواہشوں کو بے نقاب نہ کر رہی تھی، پھر وہ برآمدے میں ٹہلنے لگتا۔

چولھے کا دھواں آہستہ آہستہ برآمدے میں پھیل رہا تھا، کالا، سیاہ دھواں۔ اس دھو میں نے توجہت کو سیاہ کر دیا تھا، اور دیواریں بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو رہی تھیں، کیا اس کا دل بھی ایک دن سیاہ ہو جائے گا۔ اور روشنی کی کرن ہمیشہ کے لیے فقود ہو جائے گی، ایک دن

لڑکی کی ماں نے یہ تمام ماجرا دیکھ لیا، اسی وقت وہ لڑکی کو  
 بالوں سے گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئی، اس کے بعد اس نے  
 لڑکی کو کبھی تنہا نہ دیکھا، جب کبھی وہ قریب آتی تو اس کے  
 ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوتا، چند دنوں کے بعد معلوم ہوا  
 کہ لڑکی کو ہسٹیریا ہو گیا ہے۔ وہ رات بھر چلاتی رہتی، لڑکی کی  
 چیخیں اُسے سونے نہ دیتی تھیں، اور جب وہ بستر پر لیٹ جاتا  
 تو لڑکی کے سرخ ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے طواف کرتے  
 اور وہ دیر تک جاگتا رہتا، اور پھر اسے معلوم ہوا۔ کہ لڑکی پاگل  
 ہو گئی ہے، اور اب وہ برآمدے میں بیٹھ کر جب لڑکی کو کھڑکی  
 میں کھڑا دیکھتا، تو اس کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی  
 لڑکی کے چہرے پر ایک عجیب تبسم کی مایوسی تھی، نہ وہ مسکراتی  
 تھی، نہ وہ آنکھوں کی چمک۔ اب لب بھی سرخ نہ تھے، وہ پیلے  
 اور زرد ہو گئے تھے، وہ حیرت زدہ نظروں سے اِدھر اِدھر دیکھتی  
 اور ہاتھ سے اشارے کرتی، ان اشاروں کا کیا مطلب تھا، اب  
 بھی وہ باتیں کرتی، کبھی کبھی یونہی ہنستی، اور پھر بالوں کو نوچنے  
 لگتی، اور جب بال نوچتے نوچتے تھک جاتی، تو دھیمی آواز  
 میں گنگنا نے لگتی، لیکن وہ شعریت کہاں گئی، وہ موسیقی کیوں

مٹ گئی، زندگی کا سرشتیہ کیوں خشک ہو گیا؟ بیج تارے کے پھول ابھی تک سرخ تھے، آسمان بادلوں سے اسی طرح گھبرا ہوا تھا، سورج کی کرنیں اب بھی سرسبز پتوں سے آنکھ مچولی کرتی تھیں، قدرت کا حسن اسی طرح قائم بالذات تھا۔ لیکن لڑکی کا حسن فنا ہو چکا تھا۔

اس روح فرسا حادثے کے بعد اس نے ساتھ والے

گھر کی طرف نگاہ کی تھی، ساتھ والے گھر اور اُس کے درمیان صرف ایک دیوار تھی، دیوار کوئی خاص اونچی نہ تھی، وہ اس دیوار کو بڑی آسانی سے پھاند سکتا تھا۔ لیکن پھاندنے کے لیے اتنی ہمت نہ تھی، دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، جس میں سے وہ ایک لڑکی کو دیکھا کرتا تھا، اکثر جب صحن میں دھوپ آجاتی، سردیوں کی دھوپ بھی کتنی میٹھی اور پیاری ہوتی تھی، وہ کپڑے اتار کر اور ایک لنگوٹا پہن کر صحن میں آجاتا، اور اپنے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کرنے لگتا، کبھی کبھی لڑکی بھی اسی سوراخ سے اسے دیکھنے لگتی۔ صرف وہ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا، اُن آنکھوں کی ہر حرکت سے آشنا ہو چکا تھا، پلکوں کی ہلکی سی جنبش، ابروؤں کے کھنچاؤ سے وہ لڑکی کے جذبات کو پڑھ سکتا تھا، کبھی کبھی وہ

ایڑیوں پر کھڑی ہو کر اسے دیکھتی، تو وہ اس کے رخساروں اور لبوں کو دیکھ لیتا، 'صرف ایک ٹانگے کے لیے، 'مرف ایک لمحے کے لیے،' \_\_\_\_\_ لڑکی کے لب حرکت کرتے، اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے بادلوں میں بجلی کو نندی ہے، لڑکی کے لبوں کی جنبش، اس کی آنکھوں کی بے پناہ تڑپ، اس کے رخساروں کی ہلکی سی جھلک — وہ کبھی نہیں بھول سکتا، اور پھر وہ اپنے جسم پر زور زور سے تیل کی ماش کرنے لگتا، کبھی کبھی وہی لڑکی ایک چھوٹے بچے کو اٹھا کر سوراخ کے قریب آجاتی، اور بچے کو زور زور سے چومنے لگتی، وہ بوسوں کی اس نازک لطیف لذت بھری آواز کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ چاہتا تھا، کہ اس دیوار کو پھانڈ کر دوسری طرف چلا جائے، اور لڑکی کو اپنی باہوں میں جکڑ کر اتنے زور سے چومے، کہ اس کی روح کی بھوک اور تشنگی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ وہ ہر روز یہی ہتھی کرتا، کہ وہ آج ضرور دیوار پھانڈ کر دوسری طرف چلا جائے گا۔ لیکن یہ ارادہ ہمیشہ ارادہ ہی رہا۔ وہ اس پر کبھی عمل نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ لڑکی کے والدین کو اس بات کا علم ہو گیا، انہوں نے لڑکی کو گاؤں میں بھیج دیا، چند ماہ بعد لڑکی کی شادی ہو گئی، اس بات کو آج دو سال ہو چکے ہیں، کبھی کبھی لڑکی میکے آتی ہے، تو اس کی گود

گود میں ایک ہنستا ہوا، سُکراتا ہوا بچہ ہوتا ہے، وہ اکثر لڑکی کی طرف گرتے نظروں سے دیکھتا ہے۔ لیکن اب لڑکی کی آنکھوں میں چمک پیدا نہیں ہوتی، اس کی آنکھیں ٹھیرے ہوئے تالاب کی طرح پرسکون ہیں، اس کے ہونٹوں کی لرزش غائب ہو چکی ہے، وہ چپ چاپ اس کے قریب سے گزر جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ اسے بالکل نہیں پہچانتی، اور آج کل اس کے دائیں بائیں ایک افسروگی ہے، ایک ادا سہی ہے، ایک اجنبیت ہے، جس کے احساس سے اس کے ذہن میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اب بھی وہ کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے، لیکن کھڑکی بند ہے، اب بھی وہ سوراخ کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ لیکن کسی کے لب اب جنبش نہیں کرتے، کسی کی آنکھیں اب نہیں سُکراتیں، کسی کی پلکیں اب اس کے دل میں ارتعاش پیدا نہیں کرتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ زندگی جامد ہے۔ غیر متحرک ہے، اس کی ہر حرکت، ہر جنبش پر ایک اندھی ملاقت، ایک اندھی قوت نے قبضہ کر لیا ہے، ناچار اس کی نگاہیں، ان سرخ سرخ پھولوں کی

طرف اٹھ جاتی ہیں، اس ذہنی کشمکش، اس جنسی جمود نے اس کے دماغ پر ایک عجیب اثر ڈالا ہے، اب اس کا ذہن زہر آلود ہو گیا ہے، اب بھی وہ لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہے، لیکن اب اس کا دل زور زور سے نہیں دھڑکتا، بلکہ اسے لڑکیوں کو چھونے کی تمنا ہوتی ہے وہ ان لڑکیوں کے جسموں کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہے، وہ یہ جاننا چاہتا ہے، کہ ان لڑکیوں میں کیا ہے، کیوں نہ ان لڑکیوں کے جسموں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھے کیوں اُس کے ذہن پر قابل بیان بوجھ ہے، کیوں وہ راتیں جاگ جاگ کر کاٹتا ہے کیوں اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی کے سرخ ہونٹ پھر لکتے رہتے ہیں، کیوں کسی کی گرسنہ آنکھیں اسے پریشان کرتی ہیں۔ کیوں کسی کی لڑکھرائی اور گھبھی، غیر مسلسل چیخیں، شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح اس کے دماغ سے نکراتی ہیں، اور اسے قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتی ہیں۔ عورت اور مرد میں اتنا تفاوت کیوں ہے، اور وہ انہی باتوں سے اپنے دماغ کو پریشان کیا کرتا۔ اور لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر سرخ سرخ پھولوں کی طرف دیکھا کرتا۔

آج آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جو ٹھنڈی اور بیخ بستہ تھی، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، ماحول میں

ناقابل بیان تلخی تھی، اور اس کا نوکر چولھے میں آگ جلا رہا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کو بلایا۔ جس کا نام اس نے جرنیل رکھ دیا تھا۔

”جرنیل“

”جی حضور“

”آج بہت سردی ہے“ اس نے سانس کو ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہا، اس کی آنکھوں کے سامنے ہلکی سی دھند چھا گئی۔

”آج برف پڑے گی۔“

”جی ہاں“

”آج بھی تم اس کے گھر جاؤ گے؟“  
”پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، بابو صاحب۔“ جرنیل

ہنس کر بولا۔

”کیا تم اُس کے خاوند سے نہیں ڈرتے؟“

”بالکل نہیں صاحب“

”وہ تمہیں جان سے مار دیکے“

”میں اُس کے گھر ایک سال سے جا رہا ہوں۔“

”کیا اس کے خاوند نے تمہیں ایک بار بھی

نہیں دیکھا؟“

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، اس نے رانوں کو

زور سے دباتے ہوئے کہا۔

”وہ رات کو کہاں سوتی ہے؟“

”اپنے خاوند کے کمرے میں۔“

”تم اسے کہاں ملتے ہو؟“

”اُسی کمرے میں۔“

”جھوٹ۔“

”بالکل ٹھیک ہے صاحب۔“

”کیا وہ افیون کھا کر سوتا ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں، میں صرف اپنی محبوبہ کے

اشارے کا منتظر رہتا ہوں۔ جب وہ دروازہ کھولتی ہے تو میں

بے دھڑک اندر چلا جاتا ہوں۔“

”تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“

”بالکل نہیں۔“

”تم واقعی جرنیل ہو؟“

آسمان پر بادل زیادہ گہرے ہو رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج برف ضرور پڑے گی، وہ پہاڑوں پر سفید دھند چھائی ہوئی تھی، اور آہستہ آہستہ چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی پہاڑوں کے دامن میں پناہ گزین ہو رہی تھی، جرنیل کی محبوبہ نے اس کے دل دماغ میں ایک عجیب بنوئی کیفیت پیدا کر دی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ صبح کا ہر ذرہ بیدار ہو چکا تھا، یہ بیداری اچھی نہیں، اس نے سوچا۔ وہ نوکر کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کیا وہ اس سے کہہ دے۔ کہ ایک رات کے لئے وہ اپنی محبوبہ کو اس کے پاس بھیج دے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے، شاید وہ یہ بات سن کر نوکری چھوڑ دے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، نہیں، نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور وہ دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ کسی کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

”جرنیل، دیکھو، کون ہے۔“

”صاحب کوئی کتا ہو گا۔“

”دیکھو تو یہی۔“

پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”اندر آ جاؤ“ جرنیل نے اونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا۔ ایک عورت اندر داخل ہوئی، والائن سے گزرتی ہوئی برآمدے میں آگئی، اور پھر ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی، اس نے عورت کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ اس کے کپڑے جا بجا سے پھٹے ہوئے تھے۔ سر کے بال خاک آلود تھے وہ بارش سے بھیگ چکے تھے، اور ان کی بہت سی لٹیں، کانوں اور رخساروں سے چپکی ہوئی تھیں۔

”کیوں کیا بات ہے؟ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔“  
”میں بھوکی ہوں۔“

وہ اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔  
چہرے کی جلد سفید تھی۔ اسے کچھ ڈھارس ہوئی۔

”کیا تم کام نہیں کر سکتیں، کبانی ہتی کئی ہو اور پھریوں ہاتھ پھیلا کر مانگ رہی ہو۔“ اُس نے استہزا سے کہا۔  
”بابو۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ، میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے برآمدے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

اب وہ اس عورت کی طرف بغور دیکھنے لگا۔  
عورت کی عمر اٹھارہ یا بیس برس کی ہوگی، گندے اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے اسے بد نما بنا دیا تھا، عورت کی آنکھیں خوبصورت

تھیں، گو ان آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک نمایاں تھی، لیکن اس کی لانی پلکیں اس حزن و ملال کو چھپائے ہوئے تھیں، عورت کے خدو خال دل کش تھے، لیکن اس کے ہونٹ پتلے اور سوکھے ہوئے تھے، چہرہ بھرا ہوا تھا لیکن ناک ستواں نہ تھی، رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ صاف عیا تھا کہ اس عورت نے ایک عرصے سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ لیکن اب بھی رخساروں پر ٹٹتے ہوئے شباب کی رعنائی اور تازگی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ غربت اور بھوک نے اس لڑکی کو قبل از وقت عورت بنا دیا ہے، لیکن اس کے چہرے کی پمیدی میں بے پناہ کشش تھی وہ خاموش سی بت بن کر اس کی طرف دیکھنے لگی، اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک خوف ناک جنگل سے گزر کر ایک حسین سجے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ اب بادل سارے آسمان پر چھائے تھے، ہوا اتنی سرد ہو چکی تھی کہ جسم کو چیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی، صرف مین کی چھت پر بارش گنگنا رہی تھی، اس آواز میں موسیقیت سی تھی، جو اس کے دل کی موسیقیت سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

”جرینیل“

”جی“

”اس عورت کو گیہوں صاف کرنے کے لئے دو“

اور وہ گیہوں صاف کرنے لگی، اس نے کرسی

کو عورت کے نزدیک لاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”گلاب“ اس نے گیہوں میں سے کھنکھرتے

ہوئے کہا

”تمہارا خاوند کہاں ہے؟“

”وہ مزدوری کرنے پنجاب چلا گیا ہے۔“

”کیا وہ تمہیں روپے نہیں بھیجتا؟“

”کچھ بھی نہیں بھیجتا بابو۔“

گلاب یہ کہہ کر جلدی جلدی چھاج میں گیہوں

پھٹکنے لگی، اس کی پلکیں جھک گئیں، اور اس کے لبوں پر

اداسی کی لہر دوڑ گئی۔

”کہاں رہتی ہو گلاب؟“

”اس دھند کے پیچھے“ اس نے دو پہاڑوں

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عورت کے لب پھر کانپے، اور دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر خاموش ہو گیا۔  
 ”مہ دوری کیا دہکے بابو؟“ کلاب کے لبوں کے کونوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھرکنے لگی۔

”تمہیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟“ یہ الفاظ کہرا اس کا دل دھڑکنے لگا، اس سوال کے جواب پر اس کی مسرت کا انگوٹھا تھا۔

کلاب مسکرائی۔

اس مسکراہٹ میں کیا کچھ تھا۔ جیسے ساری کاٹنا سمیٹ کر اسی تبسم میں الٹی ہے۔ اس مسکراہٹ میں اس نے اپنی بے بسی، بیسیبتی، اپنی ناکام آرزوں، اپنی تلخ کامیوں کو چھلکتے ہوئے دیکھا، اب اسے محسوس ہوا۔ کہ اسی عورت کے لب پھیکے اور سوکھے نہیں ہیں، بلکہ ان پھولوں کی طرح سرخ اور نرم و نازک ہیں، اس لڑکی کی لبوں کی طرح، جو پائگل ہو چکی ہے۔ ان آنکھوں میں وہی چمک نمایاں ہے جو اس نے ساتھ والے گھر میں لڑکی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ نے اسے بے دست و پا کر دیا۔ وہ طوفان جو بڑوں سے اس کے سینے میں متلاطم تھا، آج

سرخ لاوے کی طرح اُس کے جسم سے چھوٹ نکلا۔ اس نے عورت کے سیاہ بالوں کی طرف دیکھا ان پر خاک جمی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اُن بالوں کو چھونا چاہتا تھا، اُس کی نگاہیں سیاہ بالوں سے ہوتی ہوئی، اُس کی سپید کھلی پیشانی کو چھوتی ہوئی، اس کی ناک کاں، رخساروں اور لبوں کو مس کرتی ہوئی اس کے سینے کی طرف بڑھیں، وہاں ایک میلا سا پھٹا ہوا دوپٹا پھیلا ہوا تھا، نگاہیں بڑھتی گئیں، پھیلتی گئیں، ذہن پر تاریکی چھا گئی، نرم و نازک غیسہ مرئی تاریکی، پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کی طرح۔ بجلی کی لہر آنکھوں میں تڑپنے لگی، کان سرخ ہو گئے، اور آنکھیں نہایت میاکی سے کپکپاتی ہوئی اس کی ٹانگوں کی طرف گئیں، شلووار جا بجا پھٹی ہوئی تھی، اور عورت کی رانیں بے نقاب ہو رہی تھیں، کتنی سفید جلد تھی، اور اس جلد پر ہلکی پتلی سی لکیریں، وہ اس جلد کو چھونا چاہتا تھا۔ یہ سفیدی کیا ہے، اس گوشت میں کیا ہے۔ اگر وہ اس گوشت کو چھوئے۔ تو وہ کیا محسوس کرے گا؟ یہ سفید سفید لکیریں کہہ جاتی ہیں وہ سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔

گلاب نے اُس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں

مسکرائیں۔

”تمہیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟“  
 ”روپے“ اگلاب نے چونک کر کہا۔ جیسے کسی  
 بھیمانک خواب کو دیکھ کر جاگی ہو۔

”ہاں“

”آٹھ آنے“

”میں تمہیں آٹھ آنے نہیں، بلکہ ایک روپیہ،  
 دو روپے، تین روپے، چار روپے دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ رک گیا۔  
 گلاب نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”اگر تم میری بات مان جاؤ۔“ اس کا دل زور  
 زور سے دھڑکنے لگا۔ گلاب نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

”تم اندر آ جاؤ،“ یہ الفاظ وہ جلدی سے کہہ گیا  
 اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کوئی غیبی قوت اس سے یہ الفاظ کہلوا رہی  
 ہے۔ ایک ایسی غیبی قوت جسے وہ پہچان نہیں سکتا۔ جس کی ہرگز  
 اس کے جسم میں آگ لگا رہی ہے وہ ایک ایسی لذت ایسے  
 تعیش سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ جس کی گراں باری کا وہ متحمل نہیں  
 ہو سکتا، اس کی روح نے بچپن کے بوسیدہ کپڑوں کو اتار کر نیا  
 قالب اختیار کر لیا تھا۔ وہ اپنی روح کی طاقت سے ایک ایسی چیز

کی تخلیق کرے گا جو نہایت نرم، خوبصورت، غیر فانی اور غیر محسوس ہونے والی ہوگی۔ اس کے خون میں شعلے بھر کئے لگے، اور اس کے زخاں آنتنیں ہو گئے۔ آہستہ آہستہ تاریکی پہاڑوں پر سے پھسلنے لگی۔ پوٹھوں سے پھسلتی ہوئی جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی، درختوں سے اکھیلیاں کرتی ہوئی پتوں کو چومتی ہوئی نیچے کی طرف بڑھی یہاں اب سبزہ ہی سبزہ تھا۔ نرم، ملائم، فمخلیں گھاس، اگنے، جھل اب معدوم ہو رہے تھے، پہاڑ کے، امن میں کچھ سنگلاخ چٹانیں تھیں، جن کے قریب دریا آہستہ آہستہ بہ رہا تھا، تاریکی سطح آب کو چھوتی ہوئی شہر کی طرف بڑھی، شہر کے مکانات کو آغوش میں لیتی ہوئی، تاریک اور گندی گلیوں سے گزرتی ہوئی پنختارے کے درخت کی طرف بڑھی اور پھر اس کے جسم کے ارد گرد چھانے لگی اس نے محسوس کیا۔ کہ اب اور کوئی راستہ نہیں، اب مکمل اندھیرا ہو جائیگا۔ اور پنختارے کے پھول بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ یہ اذیت ناک سردی، یہ پھیلے ہوئے بادل یکایک تاریکی میں سما جائیں گے۔ بادل خاموشی سے بھاگے جا رہے تھے اور ٹھنڈی بریلی ہوا اس کے ہاتھوں کو چھوتی ہوئی آگے نکلتی جا رہی تھی، اور اس کی رگوں میں ایک نئی زندگی، ایک نئی لذت کا

راگ موزن تھا، وہ دیزنک اپنے خیر فانی ہاتھوں سے گلاب کے جسم کو ٹٹولتا رہا۔ اس کا ہاتھ اس کی چھاتیوں سے بوتا ہوا، اس کے نرم، پھلکیے پیٹ کی طرف بڑھا، اور پھر کولہوں کو چھوتا ہوا۔ اس کی پھری رانوں سے پھسلا آج اس کے دل میں ایک وحشی راگ موزن تھا، وہ گلاب کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا، گلاب کی آنکھیں بن تھیں، اس نے گلاب کی لبوں کو چوما، گلاب کے لب ٹھنڈے تھے، اور اندر کی طرف بھینچے ہوئے تھے۔ یکایک وہ ٹھسک کر پے ہو گیا۔

”گلاب۔“ اس نے نھرائی ہوئی مایوس آوازیں کہا  
 ”بابو، اور گلاب کی آنکھیں جھک گئیں، اور  
 گلاب کے لب پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔“

اس وقت اسے محسوس ہوا کہ گلاب کا جسم ٹھنڈا ہے، برف کی طرح بالکل سرد اور سخ بستہ۔ اس ٹھنڈے لمس نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا، گلاب کے برفیلے احساس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گلاب بستر پر رنگی لیٹی ہوئی تھی جیسے وہ کہہ رہی تھی، جو کچھ کرنا ہے، کر لو، مجھے اس کام سے کوئی سروکار نہیں، کوئی واسطہ نہیں، لیکن میں انکار بھی نہیں کرتی، یہ عجیب بات ہے۔

کہ کسی کو م سے کوئی تعلق بھی نہیں اور پچھہ کسی بات سے انکو بھت  
 نہیں لیکن جس بات نے اس کے ذہن کو بیدار کیا۔ وہ عورت کی  
 سرد لمس تھا۔ کیا عورت کا جسم سرد ہوتا ہے۔ اس نے زندگی میں  
 پہلی بار کسی عورت کو چھوا تھا۔ لیکن کتنا مخ تجربہ تھا۔ اس کا جسم  
 کیوں انگاروں کی طرح جل رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا، اس  
 ننگی عورت پر غصہ آیا، جس نے اس کے تخیل کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔  
 بخلا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، نہایت سیدھی سادھی بات  
 ہے، بات کیا ہے، وہ سوچنے لگا، کچھ بھی نہیں، یہ عورت کیوں لیٹی  
 ہوئی ہے۔ اور تم کیا سوچ رہے ہو، اس کمرے میں اندھیرا کیوں ہے  
 یہ میلے اور بوسیدہ کپڑے کس کے ہیں، ان میں سے کیوں بدبو آرہی  
 ہے۔ اب اسے اس اندھیرے میں کمرے کی ہر چیز نظر آنے لگی،  
 الماریاں کھلی پڑی تھیں، ان میں وہ ادویات کی بوتلیں رکھی ہوئی  
 تھیں، ایک کونے میں تین چار ٹرینک پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے  
 میں گھی کا ٹین رکھا ہوا تھا، کیا یہ ہسپتال ہے، کیا یہ دوکان ہے، جہاں  
 گھی فروخت کیا جاتا ہے۔ کیا وہ گھی خریدنے آیا ہے بالکل نہیں،  
 وہ ایک عورت کے قریب بیٹھا ہوا ہے، یہ عورت کیوں لیٹی ہوئی  
 ہے، یونہی چپ چاپ۔ خاموش۔ ادا اس۔ یہ بولتی کیوں نہیں، یہ تو کچھ

نہیں کہتی، یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی، اس کمرے میں یہ عورت کس طرح آئی، اس کمرے میں یہ ٹرنک کس نے رکھے، چھت پر کس نے جالے بنے، کھیاں کیوں جالوں میں پھنس جاتی ہیں، اس کا ہاتھ لحاف پر جا پڑا۔ ہاں یہ لحاف ہے، اس کے حواس درست ہیں۔ وہ ابھی تک پاگل نہیں ہوا۔ یہ تکبیر ہے، یہ چادر ہے، اس غلاف پر کس نے بل بوٹے کاٹھے ہیں، یہ عورت جاتی کیوں نہیں، کیا وہ اس عورت سے کہدے کہ وہ چلی جائے، وہ خود بخود چلی جائیگی، کہاں۔۔۔ جدھر اس کا گھر ہے، مگر یہ تو بستر پر بے جان، ساکت اور غیر متحرک ہو کر رہ گئی ہے، جیسے یہی اس کا گھر ہے، کیا وہ اس عورت کو اس گھر میں رکھ لے، ان ٹرنکوں کی طرح، ان بوتلوں کی طرح، اس چھڑی کی طرح۔۔۔ کیا یہ عورت ایک چادر ہے، ایک غلاف ہے، ایک ٹرنک ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ عورت جاتی کیوں نہیں، اس نے نفرت کے احساسات سے مغلوب ہو کر اپنے دل سے پوچھا۔ یہ سوال بار بار اس کے دماغ میں گھومنے لگا۔ پھر اُسے خیال آیا۔ کہ اس عورت کو کچھ دینا چاہیے۔ اس نے دو روپے عورت کے ہاتھ پر رکھے۔

گلاب چلی گئی۔

اور وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے سے باہر

نکل کر اسے محسوس ہونے لگا کہ ابھی تک اس کے زخماں آتشیں تھے! ابھی تک اس کے جسم میں سے شعلے اٹھ رہے تھے، اس کی حالت اس بھوکے دندے کی طرح تھی، جسے گوشت تو دکھایا جائے لیکن کھانے کو کچھ نہ دیا جائے، اس حالت میں بھوک اور بڑھتی گھٹتی نہیں۔ اب بھی اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، بہت آگے، وہ دور جانا چاہتا تھا۔ بہت دور۔۔۔

جہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ گلاب کے برہنہ جسم نے اس کے اندر جنونی کیفیت پیدا کر دی تھی، جس سے وہ رہائی حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اس اندھیرے سے نجات پانا چاہتا تھا، وہ اس زہر کو اگل دینا چاہتا تھا، آج کے واقعہ نے اس کے ذہن اور تخیل کو جہنمی بنا دیا تھا، وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ برف پڑ رہی تھی، اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ لاکھوں روٹی کے ککالے ستاروں کی طرح گر رہے تھے، وہ پنہارے کے دذت کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ برف اس کے تپتے ہوئے جسم پر پڑنے لگی، اس کے سر پر، اس کے کانوں پر، اس کے کندھوں پر، اس کے پاؤں پر برف پڑتی گئی، ٹھنڈی اور سچ بستہ!۔۔۔ ہر طرف پر ارار سکوت تھا، ہر طرف خاموشی تھی، صرف برف پڑ رہی تھی، آسمان پر سپیدی ہی سپیدی

تھی، مین کی چپٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، بوختارے کے پھول برف میں مافوف ہو گئے تھے، اور ہلکل سنیدہ دکھائی دینا تھے، پانڈی کے ان آویزوں کی طرح، جو کسی خوبصورت عورت کے کانوں میں لٹکے ہوئے ہوں، صرف ایک چڑیا اپنے پروں کو سکیرتی ہوئی ایک شاخ سے دوسری شاخ تک چلی گئی، آہستہ آہستہ برف پڑ رہی تھی، خاموش۔ اداس، بے جان۔۔۔۔۔

بے کیف، برف۔۔۔۔۔ اس کے دل کی حرکت اب کم زور ہو چکی تھی، اس کے جسم کا طوفان، وہ غوغائے عظیم، اب برف کی طرح سرد ہو رہا تھا، اور اس کی حالت اس چشمے کی طرح تھی، جس کا تمام پانی یکایک سوکھ جائے، یا جیسے کوئی گونج فندا کی پہنائیوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو جائے،۔۔۔ اب وہ صرف برف کہہ دیکھ سکتا تھا۔ سپید سپید برف۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ برف۔ اور کچھ نہیں!

و حسنی

---

---

---

رگبیر نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی، وہ نہایت  
 بے صبری سے کھانے کا انتظار کر رہے تھے، آند نے گرم اونی  
 چادر اور رکھی تھی، رات کا وقت تھا، اور اکتوبر کی بیٹھی  
 سیلی ٹھنڈک جسم میں ایک عجیب ارتعاش پیدا کر رہی تھی،  
 آند کو اس گرم چادر سے ایک قسم کا ہالہانہ عشق تھا، یہ  
 گرم چادر اس کی محبوبہ نے بطور تحفہ آند کو پیش کی تھی، گو  
 اس کی محبوبہ نے ایک اور شخص سے شادی کر لی تھی، لیکن  
 آند کو اس بات کا سنج نہ تھا، کیونکہ اس گرم چادر میں بھی  
 عورت کی سی لامت تھی، اور اس کی گرمی اور تپش ایک  
 جوان عورت کے جسم سے کم نہ تھی، جب شام پڑتی تو آند

گرم پا در اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ اور کرسی پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتا اور رگبیر کی طرف پر معنی انداز سے دیکھتا، اور اس کے لبوں کے کونوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ آجاتی، اس وقت آئندہ نہایت بے صبری سے میز پر بچھے ہوئے میز پوش پر انگلیاں پھیر رہا تھا اور پھر یکایک اس نے آواز دی ”ارے منگتو، کھانا کیوں نہیں لاتے۔ پرویز نہایت آرام سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک شعر گنگنا رہا تھا، اس کے لائبے ریشمی بال کانوں سے نیچے ٹٹک رہے تھے، اور اس کے غلافی آنکھوں میں ایک عجیب سی جھک نمایاں تھی، وہ آئندہ کی آواز سن کر چونک پڑا، اور پھر میز پر ہاتھ مارتے ہوئے شعر گنگنانے لگا۔ آئن نے پھر زور سے آواز دی، ارے منگتو، کھانا کیوں نہیں لاتے، رگبیر ہاتھوں کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف بھاگ ڈالی، باہر اندھیرا تھا، چیمبلی کے پھول اس اندھیرے میں بالکل نظر نہیں آتے تھے، صرف ان کی ہمینی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں سے نکلا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا، لیکن اس کے کانوں کے پردوں سے پھر ایک آواز نکلا، ارے منگتو، کھانا کیوں نہیں لاتے۔

منگتو ان تینوں کا نوکر تھا وہ نہایت ہی صاف اور ستھرا رہتا تھا، جب کبھی وہ نکر پہن لیتا اور اپنے بالوں میں کنگھی کر کے کھانا میز پر رکھتا، تو پرویز نوکر کو اس حالت میں دیکھ کر غصہ میں آجاتا۔ وہ منگتو کو خوب گالیاں دیتا تاکہ ہر شخص کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ منگتو نکر پہن کر ہی منگتو رہتا گا، وہ کبھی نکر پہن کر صاحب نہیں بن سکتا۔ پرویز اکثر نوکروں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ اور منگتو اکثر رگھبیر کے پاس آکر شکایت کر دیا کرتا، دیکھیے صاحب، پرویز صاحب یونہی گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ مانا صاحب کہ ہم نوکر ہیں، لیکن ہماری بھی تو عزت ہے، ہم بھی تو انسان ہیں۔ آخر آپ لوگ بھی ہیں آپ کیوں نہیں گالیاں دیتے۔ حسین کو تو گالیاں سننے کی عادت ہوئی ہے، لیکن میں گالیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ رگھبیر منگتو کی باتیں نہایت اہمک سے سنتا۔ اور پھر منگتو سے کہتا۔ دیکھو صاحب کو گالیاں دینے کی عادت ہے۔ بہر حال میں انہیں سمجھا دوں گا۔ کہ وہ تمہیں گالیاں نہ دیا کریں اور آج جب وہ کھانا لانے میں تاخیر کر رہا تھا، تو پرویز غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے شہ گنگنا بند کر دیا تھا اور

وہ باورچی خانے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، رگبیر نے آند کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اس کے سر کے بال کافی اڑچکے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند سالوں میں آند کا سر بالوں سے صاف ہو جائے گا، اب کے منگتو نے میز پر کھانا رکھ دیا۔ آند نے گرم چادر کو پھیر اپنی ٹانگوں کے ارد گرد لپٹا، اور کرسی پر چوڑی مار کر روٹی کی طرف لپکا، آند نے گوشت کی پلیٹ اٹھائی، اور چھو ڈال کر گوشت کے ٹکڑوں کو اپنی پلیٹ میں رکھنا چاہا کہ یکایک آند نے سوچا کہ گوشت نہیں ہے۔ اس نے رگبیر اور پرویز کی طرف مفرانہ انداز سے دیکھا اور منگتو کو اتنے زور سے پکارا کہ رگبیر اور پرویز دونوں چونک اٹھے، اور وہ آند کی طرف پریشان نظروں سے دیکھنے لگے۔ دونوں نے چھ میز پر رکھ دیے اور منگتو کی طرف قبر آلود نظروں سے دیکھنے لگے، آند نے منگتو کی طرف چیخ کر کہا۔ اس پلیٹ میں کیا ہے، پرویز نے پر معنی نظروں سے رگبیر کی طرف دیکھا۔ اور ایک چھپلتی ہوئی نگاہ گوشت کی پلیٹ پر ڈالی۔ رگبیر آند کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا آند غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا، اس کے ہونٹ غصے کی شدت

سے کانپ رہے تھے۔ آند کی آنکھوں سے نثرارے نکل رہے تھے آند نے پھر چیخ کر کہا، اس پلیٹ میں کیا ہے منگتو؟ منگتو دروازے میں چپ چاپ کھڑا تھا، اسے صاف دکھائی دینا تھا کہ پلیٹ میں گوشت ہے، رگبھیر اور پرویز کو بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ پلیٹ میں گوشت ہے۔ لیکن وہ دونوں خاموش رہے اور پھر رگبھیر اور پرویز نے بھی محسوس کیا کہ پلیٹ میں گوشت ہے نہیں ہے، اگر پلیٹ میں گوشت ہوتا، تو آند کبھی یہ سوال منگتو سے نہ کرتا۔ وہ آند کو اچھی طرح جانتے تھے، آج تک اس نے کبھی ایسی حرکت نہ کی تھی جس سے کسی شخص کو گزند پہنچا ہو۔ اس کا نوکروں کے ساتھ سلوک نہایت ہی اچھا تھا۔ اور جب کبھی پرویز نوکروں کو نکالیاں دیا کرتا تھا، تو آند پرویز کو اپنے پاس بلا کر سمجھاتا، کہ یہ لوگ ہماری ہی طرح انسان ہیں، کیا ہوا۔ یہ بیچارے غریب ہیں، اور ہمارے ہاں نوکر ہیں، لیکن آج آند غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا اور منگتو کی طرف قہر آلودہ نظروں سے دیکھ رہا تھا، منگتو زیر لب مسکرا رہا تھا اور پھر وہ کہنے لگا صاحب، کھا کر دیکھئے نا، پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس پلیٹ میں کیا ہے۔

کھا کر دیکھئے نا، آند نے لفظوں کو چباتے ہوے کہا میں کہتا ہوں اس پلیٹ میں کیا ہے۔  
صاحب کھا کر دیکھئے نا، اور منگتو مسکرانے لگا۔

منگتو کی مسکراہٹ میں ایک طنز نہی، اس کی مسکراہٹ سے صاف عیاں تھا، کہ وہ آقا کے سوال کو نہایت ہی معمول سمجھ رہا ہے، اور وہ آقا اور نوکر کے رشتہ کو قائم رکھنا نہیں چاہتا، وہ اپنی حدود سے باہر جا رہا تھا۔ یہ تمام باتیں آند کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں، آند نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ اور پھر چیخ کر کہا، میں کہتا ہوں اس پلیٹ میں کیا ہے، بولتے کیوں نہیں، منگتو۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔

اور جب منگتو پھر سسکا کر چیپ ہو رہا تو آند کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، غصے سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطر نمودار ہوئے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں، ناک کے نچھنے پھل پھلنے لگے، اور چہرے پر وحشت برسنے لگی، وہ کرسی سے اٹھا، اور اس نے منگتو کی طرف گھور کر دیکھا، رگھبیر کو ایسا محسوس ہوا کہ آج آند منگتو کو جان سے مار دے گا کہ بیکایک آند نے گوشت کی پلیٹ اٹھائی اور زور سے زمین پر دے ماری، گوشت

کی پلیٹ فرش پر گرتے ہی ریزہ ریزہ ہو گئی اور سفید دیوار پر پٹیلے چمکے داغ پڑ گئے۔ پرویز یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اس نے منگتو کو خوب گالیاں دیں اور تین چار چائے رسید کئے، سالہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ بڑا بلرنا بیٹھا ہے۔ تین چار اور گھینے رسید کیے، اور اگر گھبیر آئندہ کو کپڑا نہ لیتا تو شاید آئندہ منگتو کو جان سے مار دیتا۔

رگھبیر کرسی پر بیٹھا ہوا چمبیلی کے پھولوں کی لطیف نرم و نازک خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گولپٹ فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور منگتو باورچی خانے میں زور زور سے روبرو تھا۔ پھر رگھبیر نے پرویز اور آئندہ کی طرف دیکھا، آئندہ خشک روٹیوں کی طرف ذریدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور پرویز اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے دبا رہا تھا۔ شاید پرویز کے ہاتھ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا، منگتو کو اتنے زور سے چائے پڑے تھے کہ پرویز کا ہاتھ اس درد سے ہم آہنگ ہو رہا تھا، پرویز نے مسکراتے ہوئے آئندہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر غصے سے منہ پھلا کر کہنے لگا۔ سالہ کہتا ہے، بابو صاحب، وہیں کھڑے رہئے اب نہ مار بیسے میں آپ کی عزت کرتا

ہوں، نہیں تو۔۔۔ میں اسے جان سے مار دیتا، اگر رگبیر مجھے نہ چھڑاتا۔ حرامی، وہ دن بھول گیا جب سوکھا مڑا، بھیک مانگتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا، اور کہتا تھا۔ باجوجی مجھے نوکر رکھ لیجیے، کیا میں نے ایک بار بھی اس سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو۔ کہاں رہتے ہو۔ پہلے کہاں کام کرتے رہے ہو، کیا میں نے کوئی ضمانت مانگی تھی۔ اور میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے نوکر رکھ لیا تھا، اور آج کہتا ہے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ نہیں تو۔۔۔ بڑا آیا گاما پہلوان، ایک گھونسا ماروں تو بتیں دانت باہر نکل آئیں۔

باورچی خانے سے منگتو کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ کمرے میں بجلی کی روشنی زرد ہو گئی تھی، اور باہر اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا تھا، رگبیر نے زور زور سے سانس لینا شروع کیا، لیکن چیمبلی کے پھولوں کی شہبوز اب ندرد تھی، صرف ٹھنڈی، خشک ہوا، اس کے چہرے سے نکلا رہی تھی۔

”دراصل پلیٹ میں گوشت ہی تھا۔“ آندرنے

پھینکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اور وہ اپنے بالوں میں چھوٹی چھوٹی انگلیاں پھیرنے لگا۔ اب آند مضمحل اور افسردہ نظر

آتا تھا۔

”پلیٹ میں گوشت ہی تھا، اور کیا ہو سکتا ہے“

پرویز نے قہر آلود نظروں سے آنند کی طرف دیکھا۔

”پلیٹ میں تھا ہی گوشت“ رگبیر نے لفظ گوشت

پر زیادہ زور دیا۔

”مجھے آج کے واقعہ پر زیادہ افسوس ہے، میری

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا، یہ جانتے ہوئے کہ

پلیٹ میں گوشت ہے، مجھے یوں خیال آ گیا کہ پلیٹ میں گوشت

نہیں ہے۔“ آنند نے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی جانتا تھا، بلکہ دیکھ رہا تھا کہ پلیٹ میں

گوشت ہے، لیکن میں بھی چپ رہا، اور تمھاری طرف دیکھتا رہا،

اور یہی خیال کرتا رہا کہ تم خود بخود سمجھ جاؤ گے۔ بھارے کو

یونہی مار پڑی، بھلا منگتو کا اس میں کیا قصور تھا“ رگبیر نے

سوکھی روٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن اُس نے بتایا کیوں نہیں کہ پلیٹ میں

گوشت ہے۔“ آنند نے چمک کر کہا۔

”ہاں سب سے آہم بات تو یہ ہے کہ آئندہ منگتو سے پوچھ رہا ہے کہ اس پلیٹ میں کیا ہے، اور منگتو کو معلوم ہے کہ صاحب غصے میں ہیں، لیکن پھر بھی پاجی مسکرا رہا ہے، جیسے وہ صاحب کے غصے کی پروا نہیں کرتا۔“ پرویز نے لال پلٹا ہو کر کہا۔

”شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں، گھبیر نے گرم چادر کو مسلتے ہوئے کہا۔“

”نوکروں سے کون مذاق کرتا ہے؟“ پرویز نے رگبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن غلطی تو میری ہے، جب پلیٹ میں گوشت ہی تھا تو یہ سوال کرنا کتنی بیہودہ بات تھی، آئن۔“ نے گرم چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔“

”کم از کم وہ بات کا جواب تو دیدیتا۔“ پرویز نے اونچی آواز میں کہا۔

”ہاں یہ اس کی غلطی ہے۔“ آئن نے دبی زبان میں کہا۔

”بچارے نوکروں پر اتنا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔“

اگر ان کا قصور ہو تو تم بے شک انہیں برا بھلا کہہ سکتے ہو۔ لیکن نوکروں کو مارنا کہاں کا انصاف ہے، یہ سراسر درندگی ہے اور کچھ نہیں۔“ رگبیر نے آہستہ آہستہ یہ الفاظ کہہ دیے۔

”ارے یار رہنے بھی دو، بڑے آئے گا نہ صنی

اب لگے اشتراکیت کا پرچار کرنے۔ نوکروں پر ظلم نہ کرو، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ میں ان باتوں کا قابل نہیں، ان باتوں سے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔“ پرویز نے سر کو جھٹک کر یہ الفاظ کہے۔ رگبیر یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا، وہ آنند کی طرف دیکھ رہا تھا، جو کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

اور جب صبح ہوئی، اور سورج کی کرنیں چمبیلی کے سفید پھولوں کو چومتی ہوئی رگبیر کے کمرے میں آئیں، تو رگبیر نے سوچا کہ منگتو نوکری چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا، اور اگر وہ فرار نہیں ہوا تو وہ رگبیر کے پاس ضرور آئے گا، اور اس سے کہے گا کہ صاحب میں آج جا رہا ہوں، میں اس وحشیانہ سلوک کو برداشت نہیں کر سکتا، یہ انسانیت نہیں درندگی ہے،

آپ ہی بتائیے، میرا کیا قصور تھا۔ صاحب کیا پلیٹ میں گوشت نہ تھا، اور دراصل صاحب، میں پر ماتما کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُس وقت میں سہی سمجھتا رہا کہ آئند صاحب مذاق کہہ رہے ہیں، اور اس مذاق میں پرویز صاحب نے پٹینا شروع کیا۔ لیکن اُس پرپٹ کے بعد نہ منگتو آیا، اور نہ ہی اس نے نوکری چھوڑی، رکھیر کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ اور اس نے دل میں خیال کیا، یہ منگتو بھی کمینہ ہے۔ اسے اپنی بے عزتی کا پاس نہیں۔ اس میں خود داری کا رتی بھر مادہ نہیں، اگر اسے ذرا بھی اپنی عزت کا احساس ہوتا۔ تو وہ ضرور گھر چلا جاتا، اُسے منگتو سے ہمدردی تھی، رکھیر چاہتا تھا، کہ وہ منگتو سے آئند اور پرویز کے وحشیانہ سلوک کے متعلق معافی مانگ کر اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر لے، لیکن اس نے پھر سوچا کہ معافی مانگنے سے کیا ہوگا، لیکن منگتو کے لیے اس کے دل میں ہمدردی ضرور تھی، لیکن منگتو کمینہ ہے، اگر وہ منگتو کی جگہ ہوتا، تو وہ کب کا نوکری چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا، چاہے اسے فاتحے کرنے پڑتے، اور اگر ایک دو دن ان صاحب لوگوں کو خود کھانا پکانا پڑے، تو انھیں ضرور اپنی کمینگی کا

احساس ہو جائے۔

اور پھر منگتو بیمار ہو گیا، بیماری سے پہلے وہ بڑی شان سے کہا کرتا تھا، کہ اسے کبھی بخار نہیں آتا، اور اگر بخار آ بھی جائے، تو وہ بخار کی پرواہ نہیں کرتا وہ آسام میں رہ چکا تھا، جہاں طیریا سے ہزاروں لوگ مر جاتے ہیں۔ اسے وہاں بھی دو تین بار بخار آیا تھا، لیکن اس نے بخار کی کبھی پرواہ نہ کی تھی، اور اکثر بخار میں گھر کا کام کاج کرتا رہتا تھا، دراصل اس کی مالکہ بہت اچھی تھی، جب کبھی وہ بیمار ہو جاتا، تو فوراً اس کی مالکہ اُسے آرام کرنے کے لیے کہتی، بیٹا اب تم کام نہ کرو، جاؤ، سو رہو، اور پھر وہ چائے بنا کر پلاتی، اور دوسرے نوکر کو بھیج کر دوا منگواتی۔ اور بڑے پیار سے اُسے دوائی پلاتی۔ وہ آسام میں چھ سال رہا تھا۔ اور جنگ شروع ہوئی تو اس کی مالکہ وہاں سے بھاگ آئی۔ اور ناچار اسے بھی وہاں سے آنا پڑا۔ منگتو کو بخار چڑھا تو رگبیر کو ایک گونہ مسرت ہوئی، کیونکہ جب رگبیر بیمار ہوتا تھا، تو منگتو چلا چلا کر رگبیر کی کی کمزور صحت کے متعلق فقرے کہا کرتا تھا۔ صاحب آپ کی

صحت بہت ہی کمزور ہے۔ دیکھیے نا، ایک دو دن کے بخار سے آپ کا کیا حال ہو گیا، اور آپ کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ میں تو ان بخاروں کی پرواہ نہیں کرتا۔

خانے

اور اب وہی منگتو، سر پر رومال باندھ کر باورچی

میں کراہ رہا تھا۔ پرویز اور آئند گھر میں نہیں تھے۔ وہ چند دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے، اور اب رگھبیر اکیلا تھا۔ اور منگتو بیمار پڑا ہوا تھا، شروع شروع میں انسانی بہردی کے جذبے کے زیر اثر وہ منگتو کو کونین کھانے کے لیے کہتا رہا۔ دیکھو منگتو یہ طیر یا ہے۔ زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں، جب بخار ٹوٹ جائے تو کونین کی گولیاں مجھ سے مانگ لینا، لیکن منگتو کا بخار نہ ٹوٹا اور وہ ساری رات کراہتا رہا۔ اور جب صبح ہوئی تو اس نے منگتو کی نبض دیکھی۔ بخار بدستور تھا۔ اس نے باورچی خانے میں جا بجا نھوک دیا تھا، باورچی خانے کا یہ حال دیکھ کر رگھبیر منگتو سے نفرت کرنے لگا، سالا، باورچی خانے سے باہر جا کر نہیں تھوکتا۔ بڑا نواب زادہ بنا بیٹھا ہے، لیکن وہ بیمار ہے، اس نے سوچا، اور اس طرح دل کو ڈھارس دیتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

آج پانچ چھ دن ہو گئے تھے۔ کہ منگتو کا بخار نہ ٹوٹا تھا۔ جب کبھی بخار ذرا بلکا ہوتا، تو پھر سردی لگ کر اور تیز ہو جاتا۔ منگتو تمام دن باورچی خانے میں پڑا رہتا، اور کراہتا رہتا۔ اب رگبیر منگتو سے نفرت کرنے لگا تھا۔ انسانی جمدردی کا جذبہ آہستہ آہستہ نفرت میں تبدیل ہو رہا تھا، شام کو رگبیر اپنے کمرے میں آیا، تو منگتو کو اس نے اپنے کمرے میں لیٹا ہوا پایا۔ وہ اس کے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ اٹھ بیٹھا، اور کہنے لگا۔ صاحب باورچی خانے میں سخت سردی تھی اور میرے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا، اس کمرے میں ہوا کم تھی، اور کچھ گرم سا معلوم ہوتا تھا، اس لیے میں یہاں چلا آیا، کیا میں رات بھر یہاں سو سکتا ہوں، اور پھر وہ زور زور سے کہانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کہانتے کہانتے آنسو آ گئے، اور بھرائی ہوئی آوازیں کہنے لگا، ابو صاحب میں مر جاؤں گا میرا سردرد سے پھٹا جاتا ہے، میرے سر پر ہاتھ رکھنے دیکھیے نا، لگتا تیز بخار ہے، ہاں بخار تو بہت تیز ہے، رگبیر نے جھجکتے ہوئے منگتو کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، لیکن تم اس کمرے میں سو نہیں سکتے، میں رات کو اکثر لکھتا ہوں، اس لیے بجلی کی

روشنی میں تم کس طرح یہاں سو سکو گے۔ یہ الفاظ کہہ کر رگبیر چپ ہو گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ منگتو کو کیا حق ہے، کہ وہ اس کے کمرے میں سو رہے، باورچی خانے میں کیوں نہیں سوتا، بڑا گیا لالٹ صاحب، آج اس کمرے میں سونا چاہتا ہے، کل اس چارپائی پر سونے کے لیے کہے گا، نمک حرام، تھوڑی دیر کے بعد منگتو گرتا پڑتا باورچی خانے میں چلا گیا، اور زور زور سے رونے لگا، او کہنے لگا۔ ماں۔ ماں۔ میں تم پر بھروسہ کرتا تھا، لیکن تم بھی اس بیماری میں میرے پاس نہیں آتیں۔ ماں میں آج مرجاؤں گا، میں آج رات کے آٹھ بجے مرجاؤں گا۔

رگبیر نے یہ الفاظ سنے۔ تو اسے اس دن معلوم ہوا، کہ منگتو کی ماں زندہ ہے، شاید اس کا باپ بھی ہو گا، شاید اس کی بہن بھی ہوگی، لیکن وہ کہاں ہیں، وہ کیوں منگتو کی تیمارداری نہیں کرتے، کیا اس نے منگتو کی تیمارداری کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، سالہا جب سے بیمار ہوا ہے، تقریباً بیس روپے تو خرچ ہو گئے ہیں، لیکن پھر رگبیر نے سوچا، کہ آئندہ کی بیماری پر دو سو روپے خرچ ہوتے تھے، اور پریوینے آنکھوں کا معائنہ کرانے کے لیے صرف پچیس روپے فیس دی

تھی، اور جب رگبیر بیمار ہوا تھا، تو آنت نے کس تن دہی سے  
 تیمارداری کی تھی، ہر روز ڈاکٹر دیکھنے آتا تھا، اور ایک زس  
 اسے دوائی پلاتی تھی، اور زس بھی کتنی خوبصورت تھی، اس  
 کی باتیں کتنی دلچسپ تھیں، اسے دیکھ کر اس کا دل زور زور  
 سے دھڑکنے لگتا تھا، اور بخار خود بخود کم ہونے لگتا تھا، دہیل  
 تیمارداری تو ایک عورت ہی کر سکتی ہے، عورت کی باریک بینی  
 آواز اس کے لبوں کی ہلکی مسکراہٹ، اس کی پلکوں کا کچھ  
 عرصہ کے لیے جھکے رہنا، اس کی نرم، گداز انگلیوں کا لمس، بیمار  
 کو ایک سکون بخشتا ہے۔ اور آج منگتو بیمار ہے، کیا  
 وہ منگتو کے لیے زس نہیں رکھ سکتا۔ جو منگتو کی تیمارداری  
 کرے، جس کے حسن اخلاق، جس کی باتوں، جس کے لمس  
 سے منگتو کو اپنی ماں کی شفقت اور بیمار کا احساس ہوسکے  
 اس کا دل جو اکثر انسانی آزادی اور سخوت کے لیے بے چین  
 رہتا تھا۔ آج یکایک نفرت کے بادلوں سے بھر گیا تھا، کیا وہ  
 منگتو کی ماں اور باپ کو تار دیکر نہیں بلا سکتا، تاکہ وہ اپنے جوان  
 بیٹے کو مرتے ہوئے تو دیکھ لیں۔ لیکن منگتو مر نہیں سکتا، اس  
 کی ہڈی بہت ہی مضبوط ہے، وہ آسام میں رہ چکا ہے، جہاں

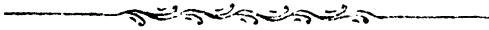
ہر سال ہزاروں لوگ — میریا کی نذر ہو جاتے ہیں اگر وہ آسام میں نہیں مرا، تو اب بھلا کیسے مر سکتا ہے۔

منگتو باہر تے کر رہا تھا، اور رگجیر کا جی منلا رہا تھا، تے کرنے کے بعد منگتو دوڑتا ہوا اس کے کمر میں آیا، اور اس کی انگٹوں سے لپٹ کر رونے لگا، صاحب میں مر جاؤں گا میں اب زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے ہسپتال میں بھیج دیجیے، میں نے چھ دنوں سے کچھ نہیں کھایا، مجھے یہاں کوئی پانی پلانے بھی نہیں، میرا مردو سے پھٹا جا رہا ہے۔ کاش کوئی میرا سر دبا سکتا، صاحب باورچی خانے میں اتنی سردی ہے، کہ وہاں انسان بیٹھ نہیں سکتا، درد جسم کے نس میں بھرا پڑا ہے، پر ماتما کے لیے مجھے ہسپتال بھیج دیجیے، اور وہ زور زور سے رونے لگا۔ اس کی آنکھیں بلدی کی طرح زرد تھیں، پہلے سے زیادہ دبلا اور مدقوق نظر آ رہا تھا، اس کی زرد آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں، اور پھر وہ زور زور سے سانس لینے لگا، اور وہیں بیٹھے ہوئے اس نے تے کی رگجیر یہ دیکھ کر غصے سے آگ ہو گیا، اس نے جی میں آیا کہ منگتو کو کمرے سے باہر پھینک دے اور دھتکے دے کر ہمیشہ کے لیے گھر سے باہر نکال دے۔ گنڈا گنڈا

اجڈ، گنوار، سارا قالین تباہ کر دیا، حرامزادے نے اُسے — وہ چاہتا تھا کہ پاؤں کی ٹھوکر مار کر منگتو کو باورچی خانے میں پہنچا دے لیکن اس نے اپنی بڑھتی ہوئی ٹانگ کو پیچھے ہٹا لیا، اور جب منگتو اپنے کمرے میں چلا گیا، تو اس کے دل میں ہمدردی کا چشمہ پھوٹ پڑا، وہ چاہتا تھا، کہ منگتو کے پاس جا کر اس کا سر دبائے، اسے پانی پلائے اس سے یہ کہہ دے کہ تمہاری ماں آرہی ہے، تمہارا باپ ابھی تک زندہ ہے، اور جلد ہی آجائیگا تمہاری بہن تمہیں دیکھنے کے لیے کتنی بے قرار ہے، تم بھی میری طرح انسان ہو، فرق صرف یہی ہے کہ تمہارا نام منگتو ہے، اور میرا نام (Raghibuddin) ہے۔

وہ رات بھر نہ سو سکا، اور جب صبح ہوئی، اور کھڑکی میں سے صبح کی تازہ ٹھنڈی ہوا، اس کے کانوں کو چھوتی ہوئی کمرے میں پھیل گئی تو وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا، اور منگتو کو آواز دی، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دوڑتا ہوا منگتو کے کمرے میں گیا، منگتو کمرے میں لیٹا ہوا تھا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اس نے زور سے آواز دی، منگتو، ارے منگتو، لیکن

کوئی جواب نہ آیا، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اس نے نبض دیکھی، نبض بالکل بند تھی، صرف آنکھیں کھلی تھیں۔ شاید اب بھی وہ کسی کا انتظار کر رہی تھیں، لیکن انتظار کرتے کرتے پتھر اگئیں منگتو کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا، اس کے لب سکر گئے تھے اور چہرے کی جلد سیاہ ہو گئی تھی۔ رگبھیہ نے اس کی آنکھیں بند کر دیں، کم از کم موت کے بعد تو یہ آنکھیں آرام کر سکیں، اور سر سے لے کر پاؤں تک اس نے ایک چادر منگتو پر ڈال دی، اور اس دن اسے احساس ہوا کہ وہ پرویز اور آئندہ سے بھی زیادہ کینہ ہے۔ وہ ایک وحشی ہے!



---

---

پہا لیبہ کی چوٹی

---

---



یہ دو سال کی بات ہے کہ وائس چانسلر نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دیتے ہوئے کہا: "آج میں تمہیں وہ انعام دیتا ہوں جس کے لیے تم ساری عمر مرگداں رہے۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر میں تمہیں بی۔ اے کی ڈگری دیتا ہوں۔ اس ڈگری سے تم ایک اعلیٰ نوکری حاصل کر سکو گے اور اس کے بعد تم ایک لڑکی خرید سکو گے۔ جس سے شادی کر کے تم اسٹس بچے پیدا کر سکتے ہو۔ تاکہ ہندوستان کی آبادی اور افلاس میں اور اضافہ ہو سکے۔"

میں نے یہ کاغذ کا ٹکڑا لے لیا اور اسے دوہرا کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کو پاکے میں بہت

خوش ہوا۔ ہر طرف زندگی ناچتی ہوئی نظر آئی۔ ستارے خوشی سے گارہے تھے۔ اور فرشتے میری کامیابی پر پھول برسائے تھے میں نے دیکھا کہ لوگ میرے پاس آ آ کے کہہ رہے ہیں۔ یہ نوکری لے لو۔ وہ نوکری لے لو۔ لیکن میں انھیں یہی جواب دیتا ہوں بھئی ٹھہر جاؤ۔ ذرا غور کر کے جواب دوں گا۔“

میں نے دیکھا کہ کئی لوگ اپنی لڑکیاں میرے ساتھ بیاہنے کے لیے تیار ہیں اور اپنی لڑکیوں کی تعریفیں کرتے کرتے انھوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔

”اجی میری لڑکی رتن پاس ہے رتن بیسنا پرانا جانتی ہے لگاتار دس گھنٹے کام کر سکتی ہے۔“

”اجی میری کملا۔ وہ تو دسویں پاس ہے۔ اسے ہندی آتی ہے۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ مدراسی۔ تلگو زبان بھی جانتی ہے۔“ میں نے سوچا کہ ایسی بیوی ضرور ہونی چاہیے۔ کیونکہ پھر کسی ترجمان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

”اجی میری کملا۔ وہ تو بی۔ اے پاس ہے خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کتنی قابل اور ذہین ہے۔ وہ تو سوسائٹی گرل ہے۔ اس کے حسن کے متعلق کچھ نہ پوچھیے۔ اس کا قد

ڈاروتھی لیمر کا سا ہے۔ تاک گریٹا گا ربو جیسی۔ اس کے ہونٹ مارلین ڈیڑچ کے ہونٹوں کے مانند ہیں۔ "میری لڑکی! وہ تو سادگی کا مجسمہ ہے۔ ایک جیتی جاگتی سیتا۔ آپ کو خوش رکھے گی۔ اور ہر سال ایک خوب صورت بچہ دے گی۔ اور پھر وہ شوہر کے انتظار میں ساری رات جاگ سکتی ہے۔"

میں نے سوچا یہ بھی کتنی خوبی ہے کہ بیوی تو تمام رات جاگتی رہے اور شوہر باہر گلچھڑے اڑائے۔ اور پھر ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ محلے میں پہرے دار کی ضرورت نہیں رہتی یہ سہا دے خواب بنتے اور مٹتے رہے ایک سال اور گزر گیا نہ نوکری ملی اور نہ بیوی۔ پہلے پہل میں نے گورنمنٹ کی نوکری کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی خامی نکل آتی۔ پہلی اسامی اس لیے نہ ملی کہ میں غیر زراعت پیشہ نکلا۔ دوسری جگہ سے اس لیے محروم رہا کہ میں اشتراکی ہوں۔ تیسری جگہ اس لیے نہ دی گئی کہ ڈاکٹروں نے مجھے نوکری کے ناقابل قرار دے دیا۔ اور چونھی اسامی اس لیے ہاتھ نہ آئی کہ میرے باپ دادا نے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں سرکار عالیہ کی کوئی خدمت نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ لڑائی کے فنڈ میں بھی کوئی پیسہ نہ دیا تھا۔ اس



گاندھی جی نے اسے کانگریس سے باہر نکال دیا۔ لیکن سبھا ش بوس پھر بھی لڑتا رہا۔ آخر اسے ہارمانی پڑی۔ اس کی جسمانی اور دماغی طاقتیں لڑاڑا کے تھک چکی تھیں اس نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ سیاست کو خیر باد کر کے سفیاسی بن جائے۔ تو ہاں سبھا ش بوس نے یہی کیا جو ہر ہندوستانی کرتا ہے۔ اور میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن انسان عادت سے مجبور ہے۔ اس لیے میں جھٹ اپنے گرو کے پاس پہنچا۔ تاکہ اندرونی روشنی پاسکوں۔ میرا گرو کالج کا ایک پروفیسر ہے۔ اس سے میں نے اپنی دکھ بھری داستان کہہ ڈالی۔ میری کہانی سن کر وہ بالکل پریشان نہیں ہوا۔ اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا۔ میں تمہیں ایک بات بتا سکتا ہوں۔ جس سے تم ان تمام تکلیفوں سے نجات پاسکو گے۔

”خدا راجد کہیے۔“ میں نے کہا  
 ”ایم۔ اے میں داخل ہو جاؤ۔“ پروفیسر نے  
 دہی زبان میں کہا۔

میں یہ الفاظ سن کر بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کہیں پروفیسر مجھے اُلو تو نہیں بنا رہا۔ تھوڑے وقفے

کے بعد پروفیسر کہنے لگا۔ تم۔ تم۔ ذہین دکھائی دیتے ہو۔ تم پروفیسر بن سکتے ہو۔ تمہاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایم۔ اے کی ڈگری پانے کے قابل ہو۔

”پروفیسر“ میں نے دہی زبان میں کہا۔ یہ نام سنتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ کتنا حسین اور پیارا لفظ ہے۔ کتنی کشش ہے اس لفظ میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی کی تمام راحتیں اسی ایک لفظ میں سمائی ہوئی ہیں۔ اور پروفیسر کی زندگی کتنی شاندار ہوتی ہے۔ جو دل میں آئے کہے جاؤ۔ پھر بھی طلباء عزت کرتے ہیں اور لیکچر ختم ہونے پر تالیاں بجاتے ہیں۔ غرض لفظ پروفیسر نے مجھ پر ایک جادو سا کر دیا۔ میں نے جھک کر پروفیسر سے کہا۔ میں ایم۔ اے میں داخل ہو جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں۔ تم پروفیسر بن سکتے ہو۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تمہارا کسی مقامی کالج میں پروفیسر مقرر ہو جانا بہت آسان ہے۔ نہیں تو کسی گریجویٹ کالج کی پروفیسری ہی سہی۔“

”کیا کہا آپ نے گرز کالج - یعنی لڑکیوں کے کالج کی پروفیسری خدایا۔ وہ بھی کتنی حسین اور مہربان زندگی ہوگی۔ بروقت خوب صورت جوان حسین لڑکیوں کی قطاریں دیکھتے جاؤ۔ اور جو جی میں آئے بکے جاؤ لیکن لڑکیاں عورت کریں گی۔ تالیاں بجائیں گی۔ اور پھر..... اگر ہو سکے تو محبت..... پھر بھی۔“

”کیا کہا تم نے؟“ پروفیسر نے زور دار لہجے میں کہا۔

”یہی کہ اگر ہو سکے تو کسی لڑکی سے رومانی

محبت.....“

فی

”جوان لڑکیوں کے متعلق باتیں کرنا ہندوستان

تہذیب کے خلاف ہے۔ لڑکیاں فرشتوں کے لیے ہوتی ہیں۔ لڑکوں کے لیے نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہم ذہنی طور پر ابھی تک ملکہ وکٹوریہ کے عہد سے گزر رہے ہیں۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ارے صاحب

ملکہ وکٹوریہ کب کی مرچکیں۔ اب تو مسز سمپسن اور ایڈورڈ

کا زمانہ ہے۔“

”ان باتوں کو بھول جاؤ۔ جنسی مسائل کے متعلق کچھ مت کہو۔ عدم تشدد کا ذکر کرو۔ ہاں تم لوگ اجمیاس کے متعلق بھی بات چیت کر سکتے ہو۔ اور ہو سکے تو برہمچریہ کے متعلق کچھ کہو۔ جاؤ میاں جاؤ۔ ایم۔ اے میں داخل ہو جاؤ۔“

اپنے گرو کے حکم کے مطابق میں ایم۔ اے میں داخل ہو گیا۔ متواتر دو سال سے ایم۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں۔ میرے ہم جماعت عجیب انسان ہیں۔ ناامیدی۔ بے کاری۔ تجرد۔ ان کے چہروں پر لکھا ہے۔ وہ سب کے سب میری طرح دھکے کھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے نوکری کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھانی ہے۔ شہر شہر کا پانی پیا ہے۔ لیکن واہری قسمت نہ نوکری ملی اور نہ بیوی۔

ان کے چہرے زرد ہیں۔ ان کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ سر کے بال اڑ گئے ہیں اور ان کی شکتلیں بھتوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ان کی جوانی

نشوونما پانے سے پہلے فنا ہی ہو گئی۔ ان کے چہروں سے بھوک اور فاقہ مستی ٹپکتی ہے۔ ہاں ایک لفظ نے انہیں پاگل بنا دیا۔ اور وہ لفظ ہے پروفیسر۔ ان نوجوانوں نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا۔ اپنے ماں باپ کو بھی اور سوچے سمجھے بغیر اس اندھی مشین کے پُرزے بن گئے۔ جوان کی انگلیوں۔ امیدوں اور خواہشوں کو کپلتی اور انہیں ایک بے جان تعلیم دیتی ہے۔ یہ مشین یا تو انہیں جن بنا دیتی ہے۔ یا صرف بونے۔ صاف ظاہر ہے یہ لوگ انسان نہیں رہتے۔ پھر بھی یہ نوجوا امید کے سایے تلے پلتے ہیں۔ ہوائی قلعے بناتے ہیں اور لفظ ”پروفیسر“ کی مالا جپتے ہیں۔

لیکن ان باتوں کے باوجود ہم سب ایک بات میں ملتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری قسمت ایک ہے۔ ہمارا مستقبل ایک ہے۔ ہمارا انجام ایک ہے۔ مجھے اپنے انجام کی فکر ہے۔ دو سال ختم ہونے کو ہیں۔ اس کے بعد کیا کروں گا؟ وہی پرانے چکر وہی پرانی آوازیں۔ ”آپ غیر زراعت پیشہ ہیں۔“

آپ کی آنکھیں کمزور ہیں۔ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ آپ کا جگر بڑھا ہوا ہے۔ آپ کے باپ دادا کی کوئی سروس نہیں۔ آپ کی سفارش کوئی نہیں۔ میاں یہاں کوئی جگہ نہیں۔“

میں اس زندگی سے بیزار ہوں۔ میری زندگی کا ساز ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے اس وقت سبھاش بابو یاد آ رہا ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں مجھے اپنے پاس بلا رہی ہیں اور پھر..... کبھی کبھی اپنا گرو۔



---

دین

---



پہلی بار جب ہم دونوں بھائی سلگام گئے، تو چائروں طرف سے ”سلاموں“ کی بوچھاڑ ہونے لگی، گھر پہنچے، تو عورتوں کا انبوہ کثیر دیکھا، گھاؤں کی تمام عورتیں ہمیں دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے لڑکے لاہور سے آرہے ہیں، اُن کی شکل و صورت کیسی ہوگی، وہ کیا پہنتے ہوں گے، وہ کس طرح گفتگو کرتے ہوں گے۔ غرض کہ عورتوں نے ہمیں دیکھا، اور ہم نے اُنھیں دیکھا، جیسے سیزر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آیا، اُس نے دیکھا، اور فتح کر لیا، یہی بات ہم نے کی، یعنی ہم آئے، ہم نے دیکھا، اور فتح کر لیا، کیونکہ عورتوں کی مجموعی رائے یہ تھی کہ ”لڑکے اچھے ہیں۔“

سلاگام ایک چھوٹا سا گھاؤں ہے۔ نہایت خوبصورت اور زرخیز۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ، نظر آتے ہیں، ان کی چوٹیاں سردیوں میں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ مشرق سے جب سورج کی اولین کرنیں، ان سرسبز، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو چوم کر، کچے گھروں میں داخل ہوتی ہیں، تو گاؤں کی گھرا گھریاں برآمدوں میں بیٹھ کر دھوپ سینکتی ہیں، ان کے نرم گدڑے ہوئے جسموں میں سورج کی کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ سرایت کرتی ہے، اور وہ نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھول کر ادھر ادھر دیکھتی ہیں، اور زندگی کی ایک نئی لذت سے آشنا ہوتی ہیں۔ گاؤں میں ان سرسبز کھیتوں، اونچے اونچے پہاڑوں، اور جوان لڑکیوں، اور بوڑھی عورتوں کے علاوہ ایک ڈاکٹر، ایک تحصیلدار، ایک تھانیدار، ایک پوسٹ ماسٹر ریاست کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی چار افسر تحصیل کی قسمت کے مالک ہیں۔ گاؤں کی حالت کو سدھارنا انہی کے ہاتھ میں ہے، میرے والد ریاست کی طرف سے اس گاؤں میں تحصیلدار تھے، اس لیے گاؤں میں ہماری کافی عزت تھی، اس پر طرہ یہ کہ ہم دونوں بھائی ٹوپ پہنتے تھے، اور ٹوپ پہننے والے

گھاؤں میں عورت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور پھر عورتوں کی مجموعی رائے یہ تھی کہ ”لڑکے اچھے ہیں“

ایک دوپہر کا ذکر ہے کہ ہم دونوں بھائی سب کے درخت کے نیچے بیٹھے گیس ہانک رہے تھے سورج کی تیز فوکیلی کرنیں سب کے پتوں سے چھن کر ہمارے جسموں پر پڑتیں اور ہم جھنجھلا کر ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جاتے کبھی کبھی تیز ہوا کا جھونکا آتا تو ہمیں تھوڑی بہت تسکین ہوتی اور پھر کوئی سڑا گلا پتہ سر پر آگرتا، یا کوئی نرم گیللا سا لچکیلا کثیر پاؤں پر خراماں خراماں چلنا، توجی بہت گھبراتا، دلوں میں عجیب سا اضطراب تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے اور کبھی کچھ نہ ہوگا اس ٹھہری ہوئی بے جان بے کیف زندگی میں حرکت کی ضرورت تھی اور جب زندگی محبت سے خالی ہو تو یوں ہی غمہ آتا ہے اپنے آپ پر۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی کان میں آکر کہہ دے کہ گھاؤں کی تمام لڑکیاں تم پر مرتی ہیں جب تم سر پر ہیٹ رکھ کر گلے میں ٹائی لگا کر اور

نیلی پتلون پہن کر چلتے ہو، تو گاؤں کی ہر نوجوان لڑکی کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے، وہ تم سے باتیں کرنا چاہتی ہیں، لیکن وہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں، کاش اس زندگی میں انقلاب آجاتا، اور دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، جیسے وہ ایک دوسرے کے خیالات اور احساسات کو سمجھ رہے ہیں کہ اتنے میں چونی لعل آگیا۔

میں نے ملائم، سرسبز گھاس پر ٹانگیں پھیلا کر کہا،  
کہو، چونی۔ کیا بات ہے۔

چونی لعل میری طرف دیکھنے لگا، وہ چاہتا تھا۔  
کہ میں یہاں سے چلا جاؤں، لیکن میں کب جانے والا تھا، آخر  
تنگ آکر چونی لعل کہنے لگا۔

یار کیا بتاؤں، گاؤں میں انقلاب آگیا ہے۔  
وہ کیسے، بھائی صاحب نے پوچھا، کانگریس کا  
تو ادھر نام و نشان بھی نہیں۔

چونی لعل نے بھائی صاحب کی طرف دیکھا،  
اور پھر مسکرا کر بولا۔ چھایا کو جلنتے ہونا، چھایا کو۔ اس کی  
بڑی لڑکی منکوال سے آج ہی آئی ہے۔

یہ سنتے ہی ہم تینوں اچھل پڑے، چونی لعل کہنے لگا، بس کیا کہوں، نہایت ہی خوب صورت لڑکی ہے، گو شادی شدہ ہے۔ مگر.....

میں اور چونی لعل بڑے بھائی کی طرف دیکھنے لگے، اُن کی خوب صورت آنکھیں سب کے پھولوں پر جمی ہوئی تھیں، پھول نہایت خوش نما اور خوب صورت تھے، پھولوں کی پتیاں کہیں کہیں سرخ اور کہیں کہیں سفید تھیں، شاید منکوال سے آئی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح۔

بھائی صاحب نے دھیمی آواز میں کہا، پوری کوشش کی جائے گی۔

چھایا اُن عورتوں میں سے تھی، جو بڑھاپے میں بھی عالم شباب کی رعنائیوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی، (سینہ کا ابھار کب کا ختم ہو چکا تھا)، ٹھوڑی کے نیچے گوشت کچھ کچھ لٹکا ہاتھا، آنکھوں کے گرد سلوٹیں پڑ چکی تھیں، اور چہرے کی جلد میں نہ تناؤ رہا تھا، نہ جوانی کی حدت، لیکن اس کے باوجود اسکی

چال میں ایک دلاویزی تھی، اب بھی جب وہ چلتی - تو  
 منگ منگ کر، سر پر دوپٹہ ڈھٹک جاتا، اور شانوں پر گر پڑتا  
 اور کانوں کے قریب سفید بال دن کی روشنی میں زیادہ  
 چمکنے لگتے۔ کم کو جھٹک کر، لابی گردن کو ایک طرف کر کے  
 جب وہ سڑک پر چلتی، تو گاؤں کے نوجوان اور بوڑھے  
 سب اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے، اور  
 اکثر نوجوان اُس کا سرو قد دیکھ کر پیچھا کرتے، اور تیزی سے  
 قدم اٹھاتے ہوئے اُس کے پاس سے گزر جاتے، وہ کن  
 آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتی اور منہ کے دوپٹے سے  
 چہرے کو ایک طرف سے ڈھانپ لیتی، اور کم کو جھٹکاتی ہوئی  
 آگے نکل جاتی، چھایا گاؤں میں عورت کی نگاہ سے نہ دیکھی  
 جاتی تھی۔ اس کا جرم صرف یہی تھا، کہ اس کا سہاگ جوانی  
 میں لٹ چکا تھا، اور اب وہ مردوں سے پردہ نہ کرتی تھی  
 اب اسے پردہ کس بات کا کرنا تھا، اس کا خاوند کب کا  
 موت کی آغوش میں تھا، عین جوانی میں اس سے منہ  
 موڑ چکا تھا۔ اب چھایا کے پاس کیا تھا، ایک لڑکا اور  
 دو لڑکیاں۔ کسی بوڑھوں نے للچائی ہوئی نظروں سے

اسے دیکھا، کئی منچلے نوجوانوں نے اپنی قسمت کو اس کے حوالے کرنا چاہا، لیکن چھایا نے سب سے یہی کہا کہ ”اب وہ شادی نہیں کریگی۔“ گوگاؤں کے بڑے بڑے پنڈت، ساہوبکا چھایا کی اس بغاوت کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، لیکن چھایا نے ان سماج کے ٹھیکہ داروں کی پروا نہ کی اور اُس نے ایک شیرینی کی طرح اس ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا۔ جب بڑی لڑکی جوان ہوئی تو اس کی شادی منکوال کر دی اور جب لڑکے کی عمر تیرہ سال ہوئی، تو چھایا نے لڑکے کو دوکان کھول دی، چھایا کا قصبے کے بڑے امیروں کے گھر آنا جانا تھا، وہ ان کے گھر جاتی، ان کا کام کرتی، انھیں باتیں سناتی اور اس طرح اسے ”اوپنچے طبقے“ میں کافی رسوخ حاصل ہو گیا تھا، وہ ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھی، اور اب تو اس کی بڑی لڑکی بھی اس کے ساتھ آتی تھی، اور اس طرح ہمیں اکثر چھایا کی لڑکی کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ پھر اچانک بڑے بھائی صاحب بیمار ہو گئے، اور یہ بیماری کیا تھی؟ یہ اختلاجِ قلب تھا، بعض ڈاکٹر تو اسے بیماری ہی نہیں سمجھتے، لیکن بڑے بھائی صاحب کو اس بیماری کی وجہ سے دورے پڑنے شروع

ہوئے، کئی کئی دفعہ ان کی نبض شدت سے تیز ہو جاتی، اور کبھی کبھی نہایت سست، منہ سے سفید جھاگ نکلنے لگتی، رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو جاتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ بس گئے؟ لیکن ان دوروں کا ایک اور بھی پہلو تھا، ان دوروں کے پٹنے سے اتنا ضرور ہوا کہ چھایا کی لڑکی شانتی روزانہ بھائی صاحب کی خبر گیری کے لیے آیا کرتی، اور ان کے سرھانے کئی کئی گھنٹے بیٹھا کرتی۔ اور جب بھائی صاحب کا دورہ ٹھیک ہو جاتا، تو نہایت ہی محبت آمیز لہجے میں پوچھتی اب طبیعت کیسی ہے، کیا دل دھڑکتا ہے۔

جی ہاں، دھڑکتا ہے تو جیتا ہوں، ورنہ.....

پھر شانتی کی شوخ نگاہیں مسکرائیں، اس کے

سرخ لبوں پر اور سرخی آجانی، اور داہنے رخسار پر نیلی سی

رگ پھر پھڑپھڑاتی، اور میں دیر تک اس کا نیچتی ہوئی رگ کو

دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا اور

میں کمرے سے نکل کر باہر کھلی فضا میں آجاتا۔

میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا کہ بھائی صاحب

کو دورے کم پڑنے لگے، شاید شانتی کی تیمارداری کا نتیجہ تھا

اور جب سے دورے پڑنے کم ہوئے شانتی نے بھی آنا کم کر دیا، آج تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا۔ نہ بڑے بھائی صاحب کو دورہ پڑا تھا، شانتی بھی ایک ماہ سے نہیں آئی تھی، میں نے سوچا، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے بھائی صاحب سے پوچھا۔ ”ایک عرصے سے شانتی آپ کی مزاج پرسی کرنے نہیں آئی۔“

”دورہ ہی نہیں پڑا۔ وہ بچاری کیسے آتی اور وہ میری طرف دیکھنے لگے۔“

”کم از کم ایک ماہ میں ایک دورہ تو پڑنا چاہیے۔“ میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب میں اپنے آپ کو ٹھیک پاتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دورے نہیں پڑینگے۔“

لیکن۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔ ہے۔ کہ۔۔۔ یعنی کے شانتی۔۔۔ وہ میری طرف دیکھنے لگے اور میں کچھ شرماسا گیا۔

”اچھا کل مجھے دورہ پڑے گا۔ ذرا دھیان کھنا۔“

ہو سکتا ہے، کہ بڑے بھائی کی زندگی میں ایسی

عورتیں کئی بار آئی ہوں، لیکن میری زندگی میں شانتی ایسی عورت نے پہلی بار قدم رکھا تھا۔ میری عمر ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ یہی کوئی سترہ یا اٹھارہ برس، جب شباب کی پہلی کرن پھوٹی ہے، اور موسم بہار کی رنگینیوں اور لطافتوں سے پہلی بار انسان ہمنار ہوتا ہے، جب یہ پھیلا ہوا نیلا آسمان یہ اونچے اونچے پہاڑ، نیندی کا صاف شفاف، نزل پانی، دعا کے پھیلے ہوئے کیفیت، یہ بڑے بڑے پودے، یہ نرم و نازک گھاس کے خوشے، دل دماغ کو ایک نئی زندگی کا احساس کراتے ہیں۔ اس وقت انسان یہی محسوس کرتا ہے کہ آسمان ہمیشہ نیلا رہے گا، یہ درختوں کے پتے ہمیشہ سرسبز رہیں گے، اور اس ندی کا پانی کبھی گدلا نہ ہوگا۔ عورت کے ہونٹ ہمیشہ سرخ میں گئے، اور اس سرسبز و شاداب وادی میں خزاں کبھی پاؤں نہ رکھے گی۔ اور میں اس جذبے کے زیر اثر شانتی کی طرف دیکھتا رہتا، لیکن اس دو ماہ کے عرصے میں کبھی کھل کر بات نہ کر سکا۔ اکثر میں اس کی موٹی موٹی، رسیلی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہتا، جو شاید بھائی صاحب کے زرد چہرے پر جی راتیں اور جب کبھی وہ بیباکانہ انداز سے میری طرف دیکھتی، تو میرا

دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور میں اس کی طرف بالکل نہ دیکھ سکتا، لیکن اُس کے رنگین لبوں سے نکلی ہوئی باریک سوانی آواز میرے جسم کے اندر ایک لطیف ارتعاش پیدا کر دیتی، اس کے ریشمی کپڑوں کی سربراہٹ اور اس کے بالوں سے نکلی ہوئی ہلکی ہلکی خوشبو مجھے بے چین کر دیتی، یہ باتیں ایک طوفان کی طرح میرا تعاقب کرتیں اور میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آتا۔

دوسرے دن بستر سے اٹھتے ہی بھائی صاحب

نے کہا، کہ اُن کی طبیعت نامناسب ہے، جوں جوں وقت گزرتا گیا، طبیعت خراب ہوتی گئی، پھر اپانک دورہ پڑ گیا، اور وہ چپ چاپ بستر پر دراز ہو گئے، سارے گھر میں کھرام مچ گیا۔ آج دورہ کچھ زالا ہی تھا، نہ نبض سست تھی، نہ چہرہ زرد تھا، لیکن بڑے بھائی صاحب نے اس چابکدستی سے اپنے چہرے کی ہیئت کو بگاڑا تھا، کہ لہروالوں کو یہ نیا دورہ نہایت خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ غیر دوائی دی گئی، اور بھائی صاحب کی حالت سدھرنے لگی، گھاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، کہ آج تحصیلدار صاحب کے لڑکے کو پھر دورہ پڑا ہے، جیسا کہ امید تھی، شانتی بھائی صاحب کو دیکھنے کے لئے آئی، بھائی صاحب

بستر پر دراز تھے، شانتی چپکے سے آئی، اور بھائی صاحب کے سرھانے بیٹھ گئی، اُس کا چہرہ غم آلود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ کسی اہم بات کا انکشاف کرنے والی ہے، مگر آنکھوں میں وہی شوخی تھی، وہی چمک تھی، جو میں نے دو مہینے پہلے دیکھی تھی۔

شانتی تم کافی عرصے کے بعد آئی ہو۔

دورہ بھی مدت سے پڑا ہے نا۔

اور آج بھی دورہ اس لیے پڑا ہے کہ تمہیں

ایک عرصہ ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے۔

شانتی خاموش رہی اور شانتی کی سانتل کی

شلوار، جس کا رنگ شفق کی طرح سرخ تھا، میری آنکھوں میں

تیرنے لگا، اور اُس کے بالوں کی نرم، نازک، لیلیٰ فس، خوشبو

میری طرف برسی

جاتی ہو شانتی۔ یہ کون ہے، انہوں نے میری

طرف اشارہ کر کے کہا، اور کیا چاہتے ہیں۔

شانتی خاموش تھی۔

اب مجھے دورہ نہیں پڑے گا، بھائی صاحب

نے آہستہ سے کہا -

اب میں بھی نہ آؤنگی -

یہ کیوں -

کل منکوال جا رہی ہوں شانتی نے نہایت دھیمی

آواز میں یہ الفاظ کہے -

اور میں دیر تک ان الفاظ پر غور کرتا رہا اور  
کمرے سے باہر نکل آیا، میں شانتی سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ  
چند دنوں کے لیے ٹھہر جائے، تاکہ میں اس کی خوب صورت  
آنکھوں کو چند دن اور دیکھ سکوں اس کی مسکراہٹ سے چند  
دن اور لطف اندوز ہو سکوں، میں تو شانتی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا  
کیا اسے معلوم ہے، کہ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے، تو میرا  
دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے، کیا اسے معلوم ہے، کہ  
میں نے کئی بار اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن  
ہر بار کسی غیبی قوت نے میرا گلہ دبوچ دیا۔ میں اپنے دل  
کا حال بھی بیان نہ کر سکا، کیا اسے معلوم ہے، کہ میں کتنی با  
سیب کے درخت کے نیچے اس کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔

کیا اُسے معلوم ہے کہ کتنی بار میں نے اُسے سیدب کے  
 پھولوں کا گچھا دینا چاہا۔ لیکن برابر وہ میرے قریب سے  
 گزر گئی، اور سیدب کے پھول میرے ہاتھوں سے گر کر گھاس  
 پر پڑے رہ گئے، اور میری بیچارگی پر قہقہہ لگاتے رہے  
 اور نل شانتی واپس منگوال جا رہی تھی اب سورج غروب  
 ہو رہا تھا، اور آسمان پر اڑتے ہوئے بادل معصوم بچوں  
 کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، اُن کے گالوں پر شفق  
 کی سرخی تھی، اور سرد ہوا اُن کے نرم گالوں کو چوم رہی تھی  
 اب شانتی چلی جائے گی، میں اب اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گا  
 میں اس کی مدھم شہد آگیاں آواز کبھی نہ سن سکوں گا، میری  
 نظر پھر ان ابھری ہوئی چوٹیوں پر پڑی، (جو شفق کی سرخی  
 میں کسی جوان لڑکی کی چھاتیوں کی طرح ابھری ہوئی معلوم  
 ہوتی تھیں) ہوا کچھ اداس سی ہو چلی تھی، کچھ کچھ ٹمکینی سی  
 یکایک مجھے کسی باریک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے  
 مڑ کر دیکھا، تو شانتی کی بہن کمالا کو اپنے سامنے پایا۔

”سہیا بات ہے کمالا“

بہن بی آپ کو بلاتی ہیں۔

کیا کام ہے۔

مجھے معلوم نہیں۔

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔

غروب آفتاب کے بعد یہ نئی روشنی کیسی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو

شانتی کے گھر کے آگن میں پایا۔ اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا،

اور اس پاس کے مکان اندھیرے میں معدوم ہوتے جا رہے

تھے، یہ پہلی بار تھی، کہ میں شانتی کے ہاں گیا تھا، چھوٹا سا

کتچا گھر تھا، دو کمرے تھے، باہر دالان میں ایک چارپائی تھی،

میں جاتے ہی چارپائی پر بیٹھ گیا، چھایا چولہے کے قریب

بیٹھی ہوئی تھی، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی، اور اس کا اپیل

مر سے سرک گیا، اور اس کے کانوں کے قریب کے سفید

بال اس دھیمی روشنی میں چاندی کے تاروں کی طرح چمکنے

لگے۔ کہنے لگی، ”کچھ کھاپنی لو بیٹا، کیا چائے تیار کروں۔

آپ جانتی ہیں، کہ میں چائے پیتا ہی نہیں۔

پھر کیا کھاؤ۔ گے ۹

کچھ نہیں، شانتی کدھر ہے۔

وہ پانی بھرنے گئی ہے ابھی آجائگی۔ اتنا کہہ کر چھایا نے چولھے میں بیٹونک میں مارنا شروع کیں۔

اور پھر کسی کی آواز آئی، میں کل واپس منگوال

جا رہی تھی، میں نے سوچا۔ آج تم سے مل لوں، پھر شاید تم سے نہ مل سکوں، میں نے مرا کر دیکھا، تو شانتی چار پانی کے قریب کھڑی تھی، سر پر گھرا تھا، سر کے بال کچھ بھیگ چکے تھے، اور پانی کے چند قطرے پیشانی کو چومتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے، میں نے نظریں نیچی کر لیں، اور زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل میں چھایا سے ڈر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی شانتی کے بیباک لہجے نے مجھے بالکل گونگا بنا دیا۔

”آند کہاں ہے“

”وہ شام کوٹ گیا ہے، وہاں ایک رشتہ دار

کی شادی تھی۔“ چھایا نے کہا۔

تم کب جا رہے ہو، میں نے سنا ہے، کہ بڑے صاحب یہاں ٹھہریں گے، اور تم جلد چلے جاؤ گے، شانتی نے دوسری چار پانی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”گر میوں کی چھٹیاں تقریباً ختم ہی ہیں، شاید

اترسوں پھلا جاؤں، اور کیا کل تم ضرور جا رہی ہو۔

”ہاں کل ضرور جاؤنگی۔“

”اتنی جلدی کیا ہے۔ ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔

پھر اکٹھے چلیں گے۔“

نہیں نہیں۔ اسے کل ضرور جانا ہے، اسے

شادی میں خاص طور پر بلایا گیا ہے۔ اور شادی بھی قریبی  
رشتہ دار کی ہے، اور اگر کل نہ گئی۔ تو وقت پر نہ پہنچ سکیگی،  
چھایا نے میری طرف دیکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

شانتی سامنے چار پائی پر بیٹھی ہوئی تھی، میرے

اور اس کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا، میں چاہتا تھا  
کہ میں جلد از جلد اس فاصلہ کو پھاند لوں، اور شانتی کے ساتھ  
جا بیٹھوں، لیکن چھایا کی موجودگی نے ذہن پر ایک بوجھ ڈالا  
ہوا تھا، اور اگر چھایا موجود نہ ہوتی، تب بھی میرے نیے  
یہ ناممکن تھا، کہ میں شانتی کے قریب جا بیٹھتا۔ اس کی  
سانتل کی شلوار کو چھو کر دیکھتا۔ اس کے نازک، نرم، ملائم،  
ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتا۔ اس کے مسکراتے ہوئے  
لبوں پر (اپنے لب رکھتا، اس کے رخساروں پر چمکتی ہوئی آنکھوں

پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا، لیکن اتنی ہمت نہ تھی اتنی سکت نہ تھی، شرم، ڈر، جھجھک نے بے دست و پا کر دیا تھا، اور پھر میں نہیں جانتا، کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہ چھایا اندر چلی گئی، اور شانتی اپنی چار پائی سے اٹھ کر میرے قریب بیٹھ گئی، میں کچھ گہرا سا گیا، لیکن شانتی کی بیباک ہنسی نے میرے کانپتے ہوئے دل کو تقویت دی، اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شانتی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، کتنا نرم اور گداز تھا، شاید، ریشم کے تاروں سے زیادہ نرم، نازک، بیسب کے پھولوں سے مر مر میں اور سپید۔ میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا، تم نکھیں مسکرا رہی تھیں، میں اُس کے رخساروں کی طرف دیکھنے لگا، وہ گلاب کی طرح سرخ تھے، میں اُس کے لبوں کے کونوں کی طرف دیکھنے لگا، رخساروں سے دُھلک کر پانی کے قطرے کونوں کے قریب آچکے تھے، ان قطروں میں کتنی پاکیزگی تھی، ان لبوں میں کتنی آگ ہوگی، پھر میری نگاہ ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی سینے کی طرف بڑھی (میں نے سینے کو چھونا چاہا۔ لیکن ہاتھ رک گئے) اور پھر میں نے دیکھا کہ شانتی خود بخود میری طرف جھکی، شاید وہ میری بے بسی کا

اندازہ کر چکی تھی، اس کی نازک انگلیوں نے میرے گالوں کو چھوا اور اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگایا (میں نے اپنا ہاتھ اُس کے سینے پر رکھا) اُس کا دل تیزی سے حرکت کر رہا تھا، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نازک، ملائم، پرندہ میرے ہاتھوں میں پھڑپھڑا رہا ہے، اور وہ قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے، میں نے اپنے آپ کو شانتی کے آتشیں جسم کے حوالے کر دیا، اُس نے آہستہ سے میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے، میں شانتی کے ہونٹوں کے دباؤ کو محسوس کر رہا تھا، آہستہ آہستہ یہ دباؤ، میرے ہونٹوں سے پھیلتا ہوا میرے ذہن، میرے دل، میرے جسم کے گوشے گوشے میں سا گیا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، مجھے اُس وقت کسی چیز کی موجودگی کا احساس نہ رہا، بلکہ میں اپنی ہستی سے بھی بے بہرہ ہو گیا، صرف کسی کے ہونٹوں کے دباؤ کو محسوس کر رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ میں زندگی کی ایک نئی دہلیز پر کھڑا ہوں، مجھے وقت کا احساس ہے، نہ زندگی کا نہ موت کا، جہاں نہ مجھے اپنی ہستی کا علم ہے، اور نہ میں شانتی کے وجود کا احساس کر سکتا ہوں، صرف ایک تیریں، غیر واضح، لاپتہ، مبہم، پھینٹا ہوا

دباؤ، جو ہونٹوں سے ہوتا ہوا، جسم کے گوشے گوشے میں پھیل رہا تھا..... اور پھر کسی کی آواز آئی اور شانتی فوراً مجھ سے علیحدہ ہو گئی، اور دوسری چار پائی پر جا بیٹھی، میں چھایا کو سامنے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے چوری کرتے کرتے کپڑا اٹھا گیا ہوں، میں جلدی اٹھ بیٹھا، اور کچھ کہے سننے بغیر شانتی کے گھر سے باہر نکل آیا، باہر گھپ اندھیرا تھا، صرف ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے، جو میرے تپتے ہوئے گالوں سے ہمکنار ہوئے تو مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی۔ جب گھر پہنچا تو دماغ کی عجیب کیفیت تھی، طرح طرح کے خیالات دماغ میں رینگ رہے تھے، شانتی نے مجھے کیوں بلایا؟ کیا چھایا نے تمام واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اگر اُس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تو کیوں کیا۔۔۔۔۔ ان باتوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

دوسرے دن شانتی چلی گئی، گرمیوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں اور میں لاہور چلا آیا۔ میں نے شانتی کو بھلانے کی کوشش بھی کی، لیکن بھلا نہ سکا، کبھی خیال آتا، چلو منگوال

چلیں، کیونکہ شانتی نے اس الوداعی صبح کو کہا تھا۔ کہ کبھی منکوال آئے، لیکن پھر خیال آتا، کہ کیا کرو گے جا کر۔ اب شانتی وہاں اکیلی نہ ہوگی، وہاں اُس کا خاوند ہوگا۔ اور اگر اس کا خاوند پوچھ لے، کہ تم شانتی کے کیا لگتے ہو، شانتی سے کیوں ملنے آئے ہو، تو تم کیا جواب دو گے۔ پھر خیال آتا، چلو، ایک خط ہی ڈال دیں، لیکن خط لکھ کر کیا کرو گے، ان باتوں کو چھوڑ دو، ان باتوں سے کیا ہوگا۔ لیکن یہ باتیں بھولتی نہیں، زندہ رہتی ہیں، مرتی نہیں، میں نے ہر بار یہی کوشش کی، کہ اپنے آپ کو لاہور کی تمام تر رنگینیوں میں مدغم کر دوں، لیکن یہ کوششیں کارگر ثابت نہ ہوئیں، مال روڈ کی سڑکیں، لائسنس کی گشت، رنگ برنگ کی سائٹھیاں، سب شانتی کی یاد کو دل سے نہ مٹا سکیں۔ کیا شانتی مجھے بھول گئی ہوگی، کیا اُس بوسہ کا ابدی نشہ کبھی زائل ہو سکتا ہے۔

کیا اُس بوسے کی لازوال مسرت کبھی فنا ہو سکتی ہے، میں اب اُس ان جانے، لاپتہ، غیر واضح، مبہم، دباؤ کو اپنے ہونٹوں پر محسوس کر سکتا ہوں، اُس بوسے میں کتنی گرمائی تھی، اُس بوسے میں کتنا خلوص تھا، کتنا ایثار تھا، جیسے شانتی نے زندگی کی تمام قیود سے آزاد ہو کر مجھے چوما تھا، جیسے اُس وقت اُس کی شادی

نہ ہوئی تھی، اور اُس کے لب ایک کنواری، معصوم، انجان الہڑ  
 لڑکی کے لب تھے، اب کے میں پھر سلکام گیا۔ لیکن شانتی نہ آئی  
 اب محبت کا قصہ پرانا ہو چکا تھا، اُس میں وہ شدت نہ تھی، وہ  
 تپش نہ تھی، اب اذیت ناک درد کے جھٹکے نہ تھے، میں اپنے  
 دوستوں کو اپنی محبت کا قصہ بڑے طمطراق سے سناتا۔ کہ کس  
 طرح ایک لڑکی نے مجھے زندگی میں پہلی بار چوما۔ اور اُس بوسہ  
 طویل کا ذکر نہایت چٹخارے لیکر اپنے کنوارے دوستوں کو سناتا  
 میرے دوست نہایت انہماک سے اس داستان کو سنتے اور  
 کئی دوست شانتی کو گالیاں بھی دیتے، اور کہتے ہندوستان کی  
 تہذیب و تمدن میں ایسی لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں، اور میں  
 ہندوستان کے سعادت مند بیٹوں کی طرف دیکھتا، اور چپ  
 ہو جانا، میں ان کی نگاہوں کی جنسی بھوک کو دیکھ سکتا تھا، میں  
 جانتا تھا کہ کس طرح میرے دوست، سڑک پر آوارہ، بھٹکتی ہوئی  
 عریض بہ کانونوں کو چند ٹکے دے کر اپنی مفلوج شدہ روح کو چند  
 ٹائیوں کے لیے تسکین دیتے تھے، لیکن مجھے کیا اور شانتی کی یاد  
 روح کے ایک گوشہ میں کھلبلائی تھی، اور اب بھی جی چاہتا تھا، کہ  
 ایک بار پھر شانتی کو دیکھ لوں، اب کے میں نے تہیہ کر لیا، کہ اگر

شانتی سلکام نہ آئی، تو میں منکوال اُسے طے ضرور جاؤں گا،  
 گرمیوں کی چھٹیاں آئیں اور ختم ہو گئیں، اور شانتی نہ آئی، او  
 اس دفعہ تو والد صاحب کی تبدیلی بھی ہو گئی، اور انھیں سلکام  
 چھوڑ کر امرکوٹ جانا پڑا۔ انکوٹ سلکام سے ۲۵ میل کے فاصلے  
 پر ہے، اور درمیانی راستہ گھوڑوں پر طے کرنا پڑتا ہے، رہی سہی  
 امیدیں بھی خاک میں مل گئیں، اب جب میں گرمیوں کی چھٹیوں  
 میں امرکوٹ آیا، تو امرکوٹ میں خوب طیریا پڑا۔ کتنے ہی آدمی  
 اس موذی مرض کا شکار ہوئے، اور جو بیچ رہے۔ وہ اتنے کمزور  
 اور نحیف ہو گئے تھے، کہ موت کا نظارہ زندگی میں دیکھ رہے تھے،  
 لوگوں نے خدا کی منتیں کیں، چڑھاوے چڑھاوے۔ کئی بار ہون  
 کیے، خدا سے دعا کی، لیکن امرکوٹ کا خدا ہی نانا تھا، اس نے  
 لوگوں کی متحدہ آواز کو ٹھکرادیا، لوگ کہتے تھے، یہ مچھر نہیں  
 سانپ ہیں، جو اپنا زہر جسم کے اندر سرایت کر دیتے ہیں، اور  
 پھر انسان کا بیچنا محال ہو جاتا ہے۔ ہر طرف بے کسی، بے بسی،  
 یاس و حرماں، موت، بیماری، زرد چہرے، اور کونین کی گویاں  
 دکھائی دیتی تھیں، مجھے بھی ایک دو بار بخار آیا، پہلے ہی کافی  
 کمزور تھا، رہی سہی صحت طیریا کے نذر ہوئی، اور پھر معلوم ہوا

کہ شانتی سلکام آئی ہوئی ہے، چند دنوں کے بعد میں سلکام چلا گیا  
میں دو دن تک شانتی کے گھر نہ گیا، میں نے سوچا، شانتی خود  
مجھ سے ملنے آئے گی۔ لیکن جب شانتی مجھ سے ملنے نہ آئی،  
تو میں خود اُن کے گھر چلا گیا۔ جب برآمدے میں داخل ہوا تو  
سامنے کلا کو پایا۔

”بھراتاجی نمستے۔“ کلانے شرماتے ہوئے کہا۔

کلا اب کافی جوان ہو چکی تھی، میں تین سال  
کے بعد سلکام آیا تھا۔ کلا کی شکل و صورت بالکل شانتی سے  
ملتی تھی، ہاں، وہی لب، وہی ٹھوڑی، وہی ناک، وہی لبوں  
پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ۔

”اوہ۔ اب تو تم خاصی لمبی ہو گئی ہو شانتی

کدھر ہے، آئند کہاں ہے۔“

”آئند دوکان پر ہے، اور شانتی ابھی آتی ہی

ہوگی۔“ آواز میں حلاوت تھی، مٹھاس تھی۔ میں چارپائی پر  
بٹھ گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد شانتی بھی آگئی، اُس نے  
مجھے دیکھا تو ہنس پڑی۔

”بہت مدت کے بعد آئے ہو۔ کہو طبیعت تو

ٹھیک ہے نا۔

میں نے شانتی کے چہرے پر نظریں گاڑیں، چہرہ اب جاذبِ نظر نہ تھا، کنول جیسی آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں، چہرہ پر چھائیاں پڑ چکی تھیں، وہ پہلے سے زیادہ موٹی اور بھتی ہو گئی تھی، چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا، آنکھوں میں شوخی تھی نہ شرارت، اور اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔

”چائے پیو گے“

میں نے نفی میں جواب دیا۔

میرا جواب سن کر اُس کا رنگ اور زرد ہو گیا، اور دوپٹے سے پیٹ کو ڈھانپتے ہوئے اُس نے لبوں پر ایک بے جان، بے کیف ہنسی کو لانا چاہا۔ لیکن کوشش سے مسکراہٹ میں زندگی نہیں آتی۔

”اب تم کب ہمارے گھر کی چائے پیو گے“

اچھارات کو یہیں روٹی کھانا“

”لیکن تم اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہو، کیا تمہیں

اپنی مہنت کی کوئی پرواہ نہیں، تمہارے چہرے کا رنگ بھی

برود ہو گیا ہے۔“

ڈاکٹر کو دکھایا تھا، ڈاکٹر کہتا ہے، 'خون کی کمی ہے، خوراک اچھی کھانی چاہئے، اور کسی قسم کی فکر نہیں کرنا چاہئے۔ کل اُن کا خط آیا تھا، (خط میری طرف پھینکے) لکھتے ہیں، 'جلد چلی آؤ، یہاں بہت سے ڈاکٹر مل سکتے ہیں زریں بھی ہیں، اور دوائی بھی اچھی ملے گی۔'  
 "تو کب واپس جاؤ گی"

میں جلد ہی چلی جاتی، لیکن ماما جی کہتی ہیں کہ تین سال کے بعد آئی ہو، ایک دو ماہ اور ٹھہر جاؤ۔ اتنے میں چھایا بھی آگئی، اُس کے سر سے پھر دوپٹہ ڈھلک گیا، اور چھایا نے گردن کو ایک طرف جھٹک دیا، کہنے لگی۔ کتنے دن ہوئے آئے ہوئے کہاں ٹھہرے ہو، سیدھے یہاں ہی کیوں نہیں چلے آئے، تم میں اب وہ چاہ ہی نہیں رہی۔

"چھوڑو ماں جی، انھیں، اب یہ بہت بڑے آدمی ہیں، انھیں اب کس کی پرواہ ہے۔"  
 اور میں نے اٹھنا چاہا، لیکن شانجی کی آنکھیں بار بار کچھ کہہ رہی تھیں، اُن آنکھوں میں جوانی کی شکست

کا اعتراف تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں بیٹھ تو جاؤ۔ اب تم جا رہے ہو، اور شاید ہمیشہ کے لیے، لیکن میری باتیں تو سنتے جاؤ۔ مانا۔ کہ تم پہلے سے زیادہ سمجھدار اور بے باک ہو گئے ہو، تمہاری آنکھوں میں وہ معصومیت نہیں، جو پہلے تھی۔

اب تمہارا سینہ زیادہ چوڑا ہو گیا ہے، اب تم پہلے سے زیادہ لمبے ہو گئے ہو، اور میں زیادہ بد صورت ہو گئی ہوں، اب تم نے ایک ایکٹر کی طرح مونچھیں بھی رکھ لی ہیں، خیر۔ ایک بار منکوال تو آتے، تو میری دلی مراد تو پوری ہو جاتی، میں اس لیے تمہیں منکوال بلانا چاہتی تھی، تاکہ تم بھی کچھ عرصے کے لیے اس ماحول سے دوچار ہوتے، جہاں میں رہتی تھی، کم از کم تم میرے خاوند کو دیکھ لیتے، تو تمہیں معلوم ہو جاتا۔ کہ میں نے کیوں اس ماحول سے بغاوت کی، میری ماں نے اگر میری شادی ایک امیر بیوپاری سے کر دی، تو اُس میں میری ہی بھلائی دیکھی تھی، وہ سمجھتی تھی۔ کہ امیر گھرانے میں کم از کم کھانے پینے کو کافی مل جاتا ہے، اور ہوا بھی ایسا ہی، کھانے کو کافی

لا۔ طرح طرح کے کپڑے پہننے کو ملے، زیورات سے صندوق بھرے ہوئے تھے، لیکن خاوند ایسا بلا جسے دیکھتے ہی مجھے نفرت ہوگئی، ایک مدقوق دبلا تپلا سا انسان، عمر میں باپ کے برابر۔ برتاؤ میں اتنی ملائمت اور شیرینی کہ باتیں سن کر جی اکتا جائے، مجھے باپ جیسا برتاؤ اچھا نہیں لگتا، میں چاہتی تھی کہ مجھے کوئی ستائے، کوئی چھیڑے، کوئی ہنسائے، کوئی رلائے، مگر منا بھی لے، لیکن یہاں تو زندگی ایک ہی راستے پر گامزن تھی، ایک ہی سوال اور اور ایک ہی جواب، جی اکتا گیا تھا۔ اس زندگی سے نہ زندگی میں لطافت تھی، نہ مسرت، اور اگر ان حالات میں میں نے تمہارے ہونٹ چوم لیے، تو مجھے کہیں دستوں کے بیچ طوائف نہ کہہ دینا، اور اگر میری ماں نے یہ ماجرا دیکھ کر تمہیں کچھ نہ کہا، تو تمہیں اس کی عقلمندی کی داد دینی چاہئے۔ اُس نے بیوہ رہ کر جنسی بھوک کی خوفناک صورتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس نے اپنی لڑکی کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا ہے، جو اُس کی لڑکی کو کبھی مسرت عطا نہیں کر سکتا۔ اور اگر چند لمحوں

کے لیے اُس کی لڑکی خوشی کے لازوال لمحوں سے ہم کنار ہو سکتی ہے، تو اس میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کو کوئی بڑھ نہیں لگتا، اور پر ماتما کے لیے میری محبت کا ڈھنڈورا دوستوں میں نہ پیٹنا۔ سچ کہتی ہوں، جس شانتی نے تمہارے لب چومے، وہ کب کی مرچکی، اُس کی روح کب کی فنا ہو چکی، اُس کے مرنے کے نقوش کب کے خلط ملط ہو چکے، اب میری طرف کیوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو، کیا حقیقت کے چند الفاظ پسند نہیں آئے کیا ان لفظوں میں بہت تلخی ہے، شاید۔ ہو، لیکن میری طرف تو دیکھو، کہ اس خوفناک، تلخی نے میرے ساتھ کس طرح بدلہ لیا ہے، اور.....

پھر چھایا بولی۔ آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔

کل چلے جانا۔

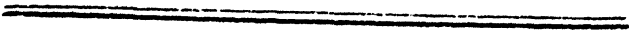
لیکن میں وہاں نہ ٹھہر سکا، اور دوسرے دن امرکوٹ چلا گیا۔ اور چند دنوں کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ شانتی کے ہاں ایک مردہ بچہ پیدا ہوا۔ اور دوسرے دن شانتی اس دنیا سے کوچ کر گئی، میں فوراً ہی ڈرائنگ روم

میں گیا۔

بڑے بھائی صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔  
 ”کیا آپ کو معلوم ہے۔ کہ شانتی مر گئی۔“  
 اُسے کیا ہوا۔ بھائی صاحب نے چونک کر کہا۔  
 ”مردہ بچہ پیدا ہوا۔ شاید زہر اثر کر گیا۔“  
 میں نے بڑے بھائی صاحب کی طرف دیکھا  
 اُن کی نگاہیں زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔



# شادی کے بعد





عورت - (بستر پر کروٹ لیتے ہوئے)  
نیند نہیں آتی -

مرد - (ٹانگوں کو پھیلا کر) میرا بھی یہی حال ہے۔ اس کمرے میں تو دم گھٹنا جا رہا ہے، کل سے تم اپنی چارپائی ساتھ والے کمرے میں رکھا کرو۔  
عورت - کھڑکی کھول دو، ہوا کتنی گرم ہے، سانس لینا دو بھر ہو گیا ہے۔

مرد - ہماری شادی کب ہوئی تھی۔ کتنا عرصہ ہوا ہے ہماری شادی ہوئے۔ کیا تمہیں یاد ہے۔

عورت - صرف چھ مہینے

مرد - اچھا یہ کھڑکی کھول دو، جس سے دم گھٹنا جا رہا ہے۔

عورت - تم کیوں نہیں کھولتے۔

مرد - عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کا حکم مانے۔

عورت - چھ مہینوں سے برابر تمہارا حکم

مان رہی ہوں، آج تم میرا کہنا مان لو۔

مرد - اب تم ضرورت سے زیادہ باتیں کرتی ہو۔

عورت - اب تم ضرورت سے زیادہ حکم

کرتے ہو۔

مرد - مرد ہمیشہ عورت پر حکومت کرتا آیا ہے۔

عورت - پرانی باتیں کب کی ختم ہو گئی ہیں،

اب نیا زمانہ ہے۔

مرد - لیکن اس دوران میں نہ عورت بدلی ہے،

اور نہ ہی مرد۔ اگر زمانہ بدل گیا ہے، تو کیا ہوا۔

عورت - زمانے کے ساتھ مرد کو بھی بدلنا

چاہیے۔

مرد - اچھا خاموش ہو جاؤ، کیوں چلا رہی

ہے۔ تمہارا چلانا مجھے اچھا نہیں لگتا، سچ پوچھو۔ تو مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے، اور میرا راجی چاہتا ہے کہ میں تمہیں کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔

عورت - (جوش میں آکر) بڑے آئے باہر پھینکنے والے، وہ دن بھول گئے جب میرے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے، میں بات تک نہ کرتی تھی، اور تم میرے مکان کے گرد تین تین چکر لگایا کرتے تھے۔

مرد - (بات کاٹ کر) اوہ - ناراض ہو گئیں ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ حرف بحرف سچ ہے۔

عورت - (بلند آواز میں کہتی ہے) میں تم غصے نفرت کرتی ہوں۔

مرد - میں جانتا ہوں۔

عورت - اگر جانتے ہو، تو پھر میرا مغز کیوں چاٹ رہے ہو۔

مرد - میں چاہتا تھا۔ کہ اس طرح نہ ہوتا، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ میں تم سے

کیوں نفرت کرتا ہوں، ابھی چند مہینے ہوئے تھے، تم سے لازوال محبت تھی۔ ہاں مجھے وہ دن یاد ہے، جب تم مجھے انارکلی کے نگرڈ پر ملی تھیں، تمہارے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ تم نے سفید رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بادلوں کا سفید ٹکڑا تمہارے ارد گرد لپیٹ دیا گیا ہو، اور تمہارے کانوں میں لٹکتے ہوئے آویزے، دو ستاروں کی طرح جھانک رہے تھے، میں جان بوجھ کر تمہارے قریب سے گزرا تھا۔ میں نے ہائے کا نعرہ نہایت دھیمی آواز میں لگایا تھا۔

عورت۔ تم اُس وقت بالکل لوفز لگتے تھے۔

مرد۔ گالی نہ دو جی۔

عورت۔ ہاں بکے جاؤ۔

مرد۔ اور تمہاری آنکھوں میں کونسی جنت

تھی، جس نے مجھے پاگل کر دیا۔ تمہاری آنکھوں میں کونسی

برق تھی۔ جس نے مجھے بے دست و پا کر دیا۔ لیکن۔ ہاں

اُس وقت میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ کاش ایسا کبھی نہ

ہوتا۔ اور وہ تمہاری سیاہ فام سہیلی، جسے اپنی لپ لٹک پر

ناز تھا۔ کہنے لگی، بات کرنے کی تمیز نہیں، افسوس کہیں کا، اور وہ آگے بڑھ گئی، اور تم میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ عورت۔ رہنے بھی دو۔ کیا آپ کو اپنی شکل و صورت پر بہت ناز ہے، تمہارے جیسے کئی لڑکے میرے آگے پیچھے پھرتے تھے۔

مرد۔ تو کس نے کہا تھا۔ کہ مجھ سے شادی کر لو۔ کسی اور سے شادی کر لی ہوتی، میں نے نانی یا پندتو نہیں بھیجا تھا۔ جو اب رعب جمانے چلی ہو، تمہاری ماں کئی بار ہمارے گھر آئیں، اُس نے منتیں لیں، اپنی لڑکی کے حق میں قصیدے پڑھے، تعریفوں کے پل باندھے، تب جا کر کہیں شادی ہوئی تھی۔

عورت۔ جی، خوب سمجھی۔ اور اپنی کارستانی بھول گئے۔ ہر روز نوکر کے ہاتھ خط بھیج دیتے تھے خطوں میں لکھا ہوتا تھا۔ کہ میں تم پر مرتا ہوں۔ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی، تو میں زہر کھا کر مرجاؤں گا۔ کاش تم نے زہر کھا لیا ہوتا۔!

مرد۔ وہ تو محض مذاق تھا۔

عورت - تو اب رونے سے کیا فائدہ ؟  
 مرد - کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر شادی سے پہلے  
 میں تمہارے انوار سے واقف ہو جاتا۔ شادی سے پہلے میں  
 سمجھتا تھا۔ کہ تم ایک دیوی ہو، تم ایک فرمانبردار بیوی کی طرح  
 میرا حکم مانو گی، گھر کا کام کرو گی، میری اندھیری زندگی میں  
 اُجالا کرو گی، لیکن یہاں تو

عورت - میں سمجھتی تھی۔ کہ شادی کے بعد نئی  
 زندگی کا آغاز ہوگا۔ وہ سنہری سپنہ کہاں گئے، میں جو کچھ دیکھا  
 کرتی تھی، وہ تو سب قروح کدھر گئی، جو میری آنکھوں کے سامنے  
 ہر وقت ناچتی رہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی، میں جو کچھ کہوں گی، وہی  
 ہوگا۔ گھر میں کام کرتے کرتے تنک گئی تھی، ماں کی گھر کیاں سن کر  
 جی اُٹا گیا تھا۔ اور جب تم کبھی مجھے نظر آجاتے تھے، تو میرے  
 جسم میں بھی لہر دوڑ جاتی تھی، ہاں خوشی کی لہر، ان گنت  
 خوشیوں کی لہریاں۔ لیکن شادی کے بعد کیا ہوا۔ کہ پہلا سکون بھی  
 گیا۔ وہ سپنہ ٹوٹ گئے، وہ تو سب قروح تائب ہو گئی۔ پھر وہی  
 کام۔ وہی گندے برتن صاف کرو، روٹی پکاؤ، آگ جلاؤ، کمرے  
 صاف کرو، فرش دھو، میٹلے کپڑوں کو صاف کرو، نہ گھر میں نوکر،

نہ چاکر۔ جب خاوند گھر آئے۔ تو غریب مسکین عورت کی طرح اُس کی خوشامد کرو، اُسے روٹی کھلاؤ، اور جو بچ جائے، وہ خود کھاؤ اور پھر تھکے ہوئے خاوند کی ٹانگیں دباؤ، سر میں درد ہو، توتیل کی مالش کرو، پیٹ میں درد ہو، تو امت دھارا پلاؤ۔ کیا انہی مصیبتوں کا نام شادی ہے، پر مانتا بچاٹ ایسی شادی سے۔

مرد۔ (ان سنی کر کے) شادی سے پہلے تم کتنی حسین کھائی دیتی تھیں۔ شملہ کی وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا، سورج کی الوداعی کرنیں، شملہ کی سرسبز پہاڑیوں کو چوم کر شام کی تاریکی میں جذب ہو گئیں، رات کے سائے گہرے بڑھتے گئے۔ اور سڑکوں پر بجلی کے قمقمے جگمگ جگمگ کرنے لگے، ہوا ٹھنڈی اور سرد تھی، تم دو تین لڑکیوں کے ساتھ شملہ کی مال روڈ پر خراما خراما سیر کر رہی تھیں، تم نے اور کوٹ پہن رکھا تھا، اور میں تمہارا تعاقب کر رہا تھا۔ تم کبھی کبھی مڑ کر مجھے دیکھ لیتی تھیں، اور میں تمہاری اس حرکت کو کتنا عزیز سمجھتا تھا۔ اُس وقت۔۔۔

مرد۔ کبھی میں تمہارے قریب سے گزر کر آئے بڑبڑاتا تھا۔ تو تم مسکرا دیتی تھیں، وہ مسکراہٹ کتنی فرحت ناک ہوتی تھی۔ اُس مسکراہٹ کا میں اُس وقت تجزیہ نہ کر سکتا تھا

بچے کیا معلوم تھا کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک چڑچڑی  
 بد مزاج 'بد دماغ لڑکی چھپی ہوئی ہے' اور میں اکثر تمھارے  
 متعلق رات بھر سوچتا رہتا تھا۔ اُس رات کئی بار تم میری آغوش  
 میں آئیں، کئی بار میں نے تمھارے لبوں کی مسکراہٹ کو اپنی  
 مسکراہٹ سے چوما، کئی بار میں نے تمھاری نیند سے جو حمل  
 آنکھوں پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹہ رکھ دئے، کئی بار میں نے  
 تمھارے سیاہ بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں اور رات بھر  
 سرگوشیاں انداز میں تم سے باتیں کرتا رہا۔ اپنے متعلق تمھارے  
 متعلق آنے والی زندگی کے متعلق شگہ کی ٹھنڈی سنج بستہ  
 راتوں کے متعلق، تمھاری پہیلیوں کے متعلق اور پھر تم میری  
 آغوش میں سو گئیں اور سبب میں جاگا، تو تمھارے چہرے کی  
 روحانی اڑچکی تھی، تمھارے بالوں کی چمک نائیب ہو چکی تھی،  
 تمھارے لب خشک اور باسی ہو گئے تھے، تمھاری تمام خوبیاں  
 فنا ہو گئی تھیں، اور تم مجھے ایک بد صورت، بیوقوف عورت  
 نظر آنے لگیں۔

عورت۔ اب میں بد صورت ہو گئی، لیکن تم  
 کیا ہو، یہ بھی جانتے ہو، تمھارے ماں باپ نے ہمیں کس طرح

پھانسا۔ تمہارے والدین کہتے تھے۔ لڑکا بڑا ذہین ہے۔ پڑھا لکھا ہے، بی۔ اے پاس ہے، (پھر ہنس کر کہتی ہے) شاید تم ہی تمام ہندوستان بھر میں واحد گریجویٹ ہو، بی۔ اے کی ڈگری لے کر پرہاتما جانے، تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو، تمہارے والدین کہتے تھے۔ لڑکا گورنمنٹ کی نوکری کرتا ہے، جیسے باقی تو جھک مارتے ہیں، مستقل جگہ ہے، جلدی ترقی مل جائے گی، اب تلوڑو ماہوار تنخواہ ملتی ہے، تین مہینوں کے بعد ایک سو پچاس روپیے ہو جائے گی اور اب شادی کے بعد عقدہ کھلا۔ کہ آپ کی کتنی تنخواہ ہے، واہ رے آپ کی گورنمنٹ سروس۔ میں کہتی ہوں۔ اگر آج لڑائی ختم ہو جائے، تو کل ہی آپ کو اس نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں، غارنٹی نوکری، گری ہوئی کلر کی، تین سو روپیے سالانہ ترقی، اور بس پر آپ اتنا اترتے ہیں، اور اپنے آپ کو باجو کہتے ہیں، اگر مجھے معلوم ہوتا۔ کہ شادی کے بعد محبت فنا ہو جاتی ہے، تو کبھی آپ سے شادی نہ کرتی۔

مرد۔ بھلا تم کتنا بڑا جہیز لائی تھیں۔ تمہارے والدین نے کونسی جائیداد میرے نام کر دی ہے، اور کون سے الاؤنس میرے نام بھیجے جاتے ہیں۔ جو منہ پھاڑ پھاڑ کر میری

تو بین کر رہی ہو، برات گئی۔ تو پانی تک کو نہیں پوچھا، کہہ دیا۔ کہ ہمارے ہاں رواج نہیں ہے، اچھا رواج ہے۔ برات آپ کے گھر جائے، اور گرمیوں کی کرکھتی ہوئی دھوپ میں۔ لیکن آپ پانی تک نہ پلائیں، کیا خوب طریقہ ہے، پیسے جمع کرنے کا، صرف دس گیارہ ساڑھیوں لے آئی ہو اور اس پر اترا تھی ہو اور لوگوں سے کہتی پھرتی ہو۔ جی ہماری کوٹھیاں ہیں۔ ہم نے گھر میں کبھی کام بھی نہیں کیا، گھر میں دو نوکر ہیں، میں نے آپ کے گھر ایک نوکر بھی نہیں دیکھا، میں جانتا ہوں یہ سب جید سازیاں ہیں ان جمانسوں میں آنے والا نہیں، اور۔۔۔

عورت۔ اور۔ اور۔ کیا۔ جب سے یہاں آئی

ہوں، آپ نے کون سے سوٹ سلا کر دئے ہیں، جہیز کے کپڑے تو پہن رہی ہوں، کبھی بھی آپ نے پوچھا۔ کہ گھر کے کام کاج کا کیا حال ہے، صبح سے لے کر شام تک گھر کا کام کاج کرتی ہوں، صرف آپ کا ہی نہیں، آپ کے والدین کا بھی، آپ کے بھائی کا بھی، یہ بھی کوئی زندگی ہے، کئی باریہ کہہ چکی ہوں، میں علیحدہ رہنا چاہتی ہوں۔ میری آپ کے والدین سے نہیں بنتی، لیکن آپ میری بات سنتے ہی نہیں، صبح روٹی کھا کر گئے، اور

شام کے سات بجے واپس آگئے، جیسے ساری گورنمنٹ کا اتھمار آپ پر ہی ہے، اگر آپ دفتر نہ جائیں، تو کیا گورنمنٹ آف انڈیا کا کام بند ہو جائے گا۔

مرد۔ کیا نام تھا اُن کا جو ہر روز ہمارے گھر آتے تھے، ہاں یاد آیا۔ لالہ گنیش داس۔ جو آپ کی تعریف کرتے کرتے مرے جاتے تھے۔ کہتے تھے لڑکی کیا ہے، میرا ہے میرا۔ گھر کا کام کاج نہایت تن دہی سے کرتی ہے، سینا پر ونا جانتی ہے، کھانا اتنا اچھا تیار کر سکتی ہے۔ کہ بڑے بڑے بلروں کو مات کر دے، اجی ایک وقت میں دس آدمیوں کا کھانا تیار کر سکتی ہے، جیسے میں رائل ہوٹل کھولنا چاہتا ہوں۔ آپ سگائی تو کر کے دیکھیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ لڑکیاں کیا ہوتی ہیں، ساس سسر کا کہنا مانے گی، جو کچھ وہ کہیں گے، وہ کر لگی اُن کی کبھی حکم عدولی نہ کرے گی۔ میں کہتا ہوں، وہ دیوی ہے دیوی۔ اور میں یہ بتانا بھول ہی گیا۔ کہ وہ کتنا اچھا گاتی ہے، اور شادی کے بعد جب آپ نے پہلی بار گایا تو مجھے احساس ہوا کہ آپ بالکل گانا نہیں جانتیں، آواز کیا تھی جیسے مینڈک رُرا رہے ہیں جو کچھ گنیش داس نے آپ کے

متعلق بتایا۔ وہ سفید جھوٹ تھا، مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ اپنی چیز کو بیچنے کے لیے سودا کر رہے ہیں۔ کاش میں نے تمہیں دکھایا نہ ہوتا، اور تمہاری آنکھوں کی بے حیائی نے مجھے دیوانہ نہ بنا دیا ہوتا۔ تو۔۔۔

عورت۔ تو آلو بننے کی کیا ضرورت تھی۔ جب شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں، تو آپ کہہ دیتے۔ کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کیا میں نے ہاتھ جوڑے تھے، کیا میں آپ کے پاؤں پڑی تھی، یا آپ جیسا خوب رولڈ کا بندوستان میں نایاب تھا۔ میں نے شادی لڑکے کیا حاصل کیا۔ پہلے گھر میں برتن صاف کرتی تھی، اب یہاں دن رات بھوکے بیل کی طرح کام کرتی ہوں، وہاں بھی محنت کرنی پڑتی تھی، یہاں بھی مزدور بنا کر رہی ہوں، آپ نے کون سی لڑائی بنا کر بٹھا رکھا ہے۔

مرد۔ کہنتی تھیں، میں اکیلی ہوں، آپ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں۔ میں یہاں اکیلی کیا کروں، اور جب ساس کو بلایا، تو ہر روز لڑائی۔ ہر روز جھگڑے۔ آج ماما جی نے یہ کہا، آج ماما جی نے وہ کہا۔ جب گھر آؤ تو منہ بسورے ایک طرف بیٹھی ہوئی ہیں، پھر ہر روز مجھ سے اس بات کا اعتراف

کراتی ہیں کہ میں ایف۔ اے پاس ہوں، تہذیب ہے تم کو سوں دور ہو۔ چھوٹے بڑے کا پاس نہیں، جب ساس تنگ، آکر چلی گئی، تو پھر وہی رونا۔ میں اکیلی ہوں جی نہیں لگتا۔

عورت۔ آپ کا جی تو لگتا ہے نا۔ وہی کالی کلوٹی بیہودہ سی عورت، جو ایک دن یہاں بھی آئی تھی، آپ کو مل گئی ہوگی، اس لیے آپ اتراتے ہیں، اب یہاں آئے تو پاؤں توڑ دوں، بڑے آئے آزادی کے طلب گار۔ غیروں کی لڑکیوں سے عشق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اور اُس کٹنی کو شرم نہیں آتی۔ اُس دن یہاں آئی، تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مکان کو دیکھ رہی تھی، جیسے چند دنوں کے بعد وہ یہیں آکر رہے گی، میں مے جاؤں گی، لیکن یہاں سے کبھی نہ جاؤں گی، اُس کٹنی کو یہاں بھی گھسنے نہ دوں گی۔ وہ کیا سمجھتی ہے۔ اپنے آپ کو۔

مرد۔ تم تو بیوقوف ہو۔

عورت۔ جی ہاں۔ اور میں جو ایک دن آپ کے دوست کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئی، تو آپ جل بھن کر رہ گئے، اور ساری رات پیٹتے رہے، ابھی تک جوڑوں میں

رد ہے۔ (سسکیاں لیتی ہے) وحشی کہیں کے۔ بڑے انسان بنتے ہیں۔ ہم آزادی کے حامی ہیں، عورتوں اور مردوں کے برابر حقوق ہونے چاہئیں، جب آپ کسی لڑکی کے ساتھ بیکر کرنے جائیں، تو ہم خاموش رہیں، خون کا سا گھونٹ پیکر رہ جائیں، اور جب ہم کسی سے بات بھی کریں، تو ساری رات ڈانٹ ڈپٹ آٹکھیں نکال دوں گا، زبان کھینچ لوں گا، یہ کروں گا۔ وہ کرونگا (سسکیاں لیتی ہے)۔

مرد۔ (کروٹ بدلنے ہوئے) بس رونے لگیں عورت کا آخری ہتھیار رونا ہے، جب اور کچھ نہ بن سکے، تو آنسو گرنے لگتے ہیں لیکن مجھے ان آنسوؤں کی رتی بھر بھروا نہیں، میں تو اپنے آپ کو کوشنا ہوں۔ کہ میں نے کیوں شادی کی، اور یہ بلا اپنے گلے کیوں ڈال لی۔

عورت۔ شادی کے چند دنوں بعد شادی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، وہ خوشی کا گھروندا آن واحد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، اس سے تو یہ بہتر ہے کہ عورت شادی نہ کرے، اور کچھ نہیں، لڑکے تو تمھاری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں پاس سے گزرتے ہیں، ہنستے ہیں، اور پھر کسی کے تصور میں

رات گزر جاتی ہے، وہ تصور کتنا بیٹھا، کتنا پُرفریب کتنا لگن ہوتا ہے، اور اب کیا ہے۔ جب کبھی باہر جاؤ، تو سوامی جی ساتھ ہوتے ہیں، اور ماتھے پر لکھا ہوتا ہے، یہ سیٹ بک ہے یعنی اس کا مالک اس کے ساتھ ہے، کوئی مسکرا کر نہیں دیکھتا اور کوئی مسکرا کر دیکھے، تو ساتھ والا مسکرانے والے کو گھور کر دیکھتا ہے، جیسے اُس سے کہہ رہا ہے۔ بے شرم دیکھتا نہیں، یہ سیٹ بک ہے، روپیہ پیٹنگلی دے چکا ہوں، خوشیاں مٹ جاتی ہیں، تہ تو را ٹوٹ جاتے ہیں، اور زندگی بے لذت اور بے کیف ہو جاتی ہے۔

مرد - اچھا یہ کبوا اس بند کرو۔ تمھاری صورت دیکھ کر مجھے قے آتی ہے۔ پر ماتما کے لیے لیمپ بجاؤ۔ تاکہ اس منحوس صورت سے چھٹکارا نصیب ہو۔

عورت - اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب کیوں چلا ہو، ہو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔

مرد - میں تمھارے ساتھ نہیں رہوں گا، میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا، میں یہاں نہیں رہوں گا۔

عورت - بھاگ کر کہاں جاؤ گے، میں تمھیں اُس کٹھنی کے ساتھ بھاگنے نہ دوں گی، میں خود ابھی مر جاؤں گی

اور اُسے بھی جان سے مار دوں گی۔  
 مرد۔ تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرنے ہو۔  
 عورت۔ کیا وہ ابھی تک میرے اور تمہارے  
 درمیان شرم کی دیوار حائل ہے لیکن تم کہاں بھاگ کر جاؤ گے  
 یہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی، اور میں صرف  
 اکیلی نہ ہوں گی۔

مرد۔ (چونک کر) تمہارے ساتھ اور کون ہوگا؟  
 عورت۔ تمہارا بچہ (سسکیاں لیتی ہے)  
 مرد۔ لیکن میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔  
 عورت۔ زیرِ لب چند تہینوں کے بعد۔  
 (عورت سسکیاں لیتی ہے اور مرد کروٹ بدلتا ہے اور پھر  
 دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)۔



---

دیوار

---



اماں ہمیشہ اسی بات پر جھگڑا کرتیں، کہ تم چھوٹے  
 بھائی کو کچھ نہیں کہتے ہو، دیکھو نا، کتنا شریر ہو گیا ہے، میری  
 بات تو مانتا ہی نہیں، اگر کوئی گھر کا کاج کرنے کے لیے کہتی  
 ہوں، تو فوراً بنا کر دیتا ہے، اور پھر باتیں اتنی بلند اور کزخت  
 آواز میں کرتا ہے، کہ کان پھٹے جاتے ہیں، ارے بابا۔ چلا چلا کر  
 یا تیخ مار کر بھی کوئی بات کرتا ہے۔ نوکر بچا کتنا ہی کام کیوں  
 نہ کرے، آخر وہ انسان ہے، دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتا  
 ہے، چند چھوٹے موٹے کام تو تمہارے بھائی کو بھی کرنے چاہئیں۔  
 لیکن اوم یہ سب کچھ سن کر بھی ٹس سے مس  
 نہ ہوتا تھا۔ اُس کی عمر چودہ سال کی ہو گی، لیکن اس قدر

شریکہ اُس کی حرکتوں سے تو خدا ہی بچائے۔ سینما کا بے حد شوقین، شہر میں کوئی فلم آئے، اوم ضرور اُسے سب سے پہلے دیکھے گا، اور اگر ماں کوئی گھر کا کاج کرنے کے لیے کہتی، تو وہ فوراً چھٹا چلاتا، شور مچاتا، ہوا گھر سے باہر چلا جاتا۔ اور پھر اکثر کہتا۔ کیا بڑے بھائی کام کرتے ہیں، جو میں گھر کا کام کاج کروں، بڑے تو ساری عمر عیش کرتے رہے، اور جب میری باری آئی، تو سبھی چلانے لگے، سینما نہ دیکھو، شام کو سیر کرنے نہ جاؤ، جیب خرچ کم لو، اونچی آواز میں باتیں نہ کرو۔ بڑوں کا ادب کرو۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اور سینکڑوں باتیں۔

میں اوم کے اظہار سے سخت نالاں تھا۔ عمر میں میں اوم سے بارہ سال بڑا تھا۔ اور میں چاہتا تھا۔ کہ اوم میری عزت کرے، میری باتوں کو غور سے سُنے، لیکن کہاں اُس نے گھر والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ماں اکثر اُسے جھڑک دیا کرتیں، لیکن والد صاحب کے پیار نے اوم کو بالکل بگاڑ دیا تھا۔ اور چونکہ گھر میں سب سے چھوٹا اوم ہی تھا، اس لیے سب سے زیادہ اُسی سے لڑ پیار کیا جاتا تھا۔ یعنی اتنی عمر ہونے کے باوجود اُسے ”رومی رومی“ پکارا جاتا تھا۔ اور وہ

ہیں، کہ لاث صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ جب کبھی میں اوم کو برا بھلا کہتا۔ تو فوراً اوم والد صاحب کے پاس جا کر شکایت کرتا۔ اور بس۔ میرا تمام رعب ختم۔ اور وہ ہیں۔ کہ چلا رہے ہیں۔ نوکروں کو جھٹک رہے ہیں، ماں کو ڈرا دھمکا کر کچیر کے لیے پیسے مانگ رہے ہیں۔ بس۔ کچھ نہ پوچھو، گھر میں ہر وقت اُس کی کرتوتوں سے ایک ہنگامہ برپا رہتا۔ ہر شخص اوم کی بدگامی سے نالاں۔ لیکن اوم کسی کی پروا نہ کرتا تھا

اور پھر ایک دن رانی آئی، رانی کی عمر بارہ برس ہوگی۔ لیکن قذکھتا ہوا تھا۔ وہ اکثر سرگوشیوں میں باتیں کیا کرتی، اگر اوم کو چلانے کی عادت تھی، تو رانی تہایت، ہی مدہم آہستہ آواز میں باتیں کرتی تھی، کبھی کبھی تو اُس کی آواز سنائی بھی نہ دیتی تھی، جیسے الفاظ گلے میں اٹک کر رہ گئے ہیں۔ صرف ایک مدہم شیریں آواز، اُس کے گلے سے نکلتی، اور اوم اکثر ماں سے کہا کرتا۔ کہ رانی کے گلے کا آپریشن کرانا چاہئے۔ لیکن ماں منس کر کہہ دیتی، کہ رانی جب جوان ہو جائے گی۔ تو خود بخود اُس کی آواز ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اکثر اوم اور رانی کو اکٹھے کھیلتے

دیکھتا۔ اکثر رانی، اوم کو سرگوشیانا انداز میں بلاتی، اور اوم  
 چپکے سے بھگی بلی کی طرح اُس کے قریب چلا جاتا۔ اور دونوں  
 باتوں میں مشغول ہو جاتے، اور میں اوم کو اس طرح خاموش  
 ساکن، چپ چاپ دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ کہ آخر اس نے زور  
 لڑ کے کو اس چھوٹی لڑکی نے قابو میں کر لیا ہے۔ میں چاہتا  
 تھا۔ کہ اوم کا مذاق اڑاؤں، لیکن میں اوم سے عمر میں کافی بڑا  
 تھا۔ اور اُس کا بڑا بھائی بھی تھا۔ اس لیے میں نے اوم سے  
 اس بات پر مذاق کرنے سے گریز کیا۔

ہاں میں ان دونوں کی حرکات سکنت کا بہت  
 غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ اب اوم کچھ عرصے سے گھر کا کام کاج  
 کرنے لگ گیا تھا۔ اور ماں بھی اوم کے متعلق کم شکایت  
 کرتیں، میں حیران تھا۔ کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے۔ کہ یہ چڑچڑا  
 نلخ مزاج لڑکا یکایک اس طرح پرسکون اور خاموش ہو گیا ہے  
 اب اوم چلاتا کیوں نہیں، اب اوم گھر کا کام کاج کیوں کرتا ہے  
 ایک حد تک میں اُس کے چڑچڑے پن کی وجہ جانتا تھا، کیونکہ  
 اوم بچپن سے لے کر اب تک کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہا تھا  
 کبھی بخار ہے، تو کبھی ٹائیفائیڈ ہے، کبھی سر کا درد ہے۔ کبھی

پیشہ کا درد شروع ہو گیا۔ اور اس طرح مختلف اقسام کی بیماریاں  
 حملہ آور ہوتی رہیں، لازمی تھا کہ اوم کی صحت کمزور ہو جاتی  
 اور اُس کا مزاج چڑچڑا اور لہجہ تلخ ہو جاتا۔ لیکن ایک دن دو سال  
 سے اُس کی صحت اچھی ہو رہی، اُس کا قلبا ہو گیا تھا، اُس  
 کے جسم پر گوشت آ رہا تھا، اُس کے اعضا متناسب ہو رہے  
 تھے، لیکن مزاج بدستور چڑچڑا تھا، ہم ہزار جتن کرتے، لیکن  
 اس تلخ مزاجی میں فرق نہ آتا۔ اب رانی کی آمد سے یہ مسئلہ  
 خود بخود حل ہو رہا تھا، اب اوم کی تلخ مزاجی جاتی رہی، اُس  
 کی باتوں میں نرمی آگئی، جس کا عنصر اُس کی باتوں میں پہلے  
 مفقود تھا، اب وہ بازار جاتا تھا، اور گھر کے لیے چیزیں خرید کر  
 لاتا تھا، رانی اُسے طرح طرح کی چیزیں لانے کے لیے کہتی، دیکھو  
 کچوریاں اور کپوٹیاں لے آؤ، اہم۔ اور اوم صاحبہ بوجھوٹی  
 سی فرمائش پر گرم ہو جایا کرتے تھے، ایک زر خرید غلام کی طرح بازار  
 جا رہے ہیں، دیکھو، ملائی کی برف والا باہر کھڑا ہے، دو پیسے کی  
 ملائی کی برف لے آؤ، اور اوم صاحبہ ملائی کی برف ملا رہے  
 ہیں، میرے پاس کاپیاں نہیں ہیں، مجھے اسکول کا کام کرنا ہے،  
 ذرا بازار سے کاپیاں لاؤ، اور اوم صاحبہ کر لکتی دیکھو، میں

بازار جا رہے ہیں، اور رانی کے لیے کاپیاں لارہے ہیں، مجھے سائیکل چلانا نہیں آتا، بس دوسرے دن اوم رانی کو سائیکل چلانا سکھا رہا ہے، اور جب رانی اوم کو بلاتی، تو اوم کبھی بلند آواز میں جواب نہ دیتا، چپکے سے اُس کے قریب چلا جاتا اور دونوں باتیں کرنے لگتے، دونوں خوش تھے، آپس میں باتیں کرتے، ہنستے، کھیلتے، کودتے، اور اسی طرح اوم کے مزاج میں خوش لمبی خود کرنے لگی، رانی کی چھٹیاں ختم ہو گئیں، اور رانی اپنے گھر چلی گئی۔ ایک سال گزر گیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں آئیں، اس دفعہ اوم رانی کے گھر گیا۔ وہ اکثر بلاس پور چلا جاتا، کیونکہ رانی کے گھر والوں اور ہمارے گھر والوں کے تعلقات اچھے تھے۔ دو تین مہینوں میں اوم نے صرف ایک یا دو خط لکھے، اور وہ خط بھی نہایت مختصر تھے، کہ بلاس پور کی آب و ہوا اچھی ہے، آم بکثرت ملتے ہیں، اور ہم نہ کہے کہارے جا کر خوب آم کھاتے ہیں، والدین سے ایک دو بار لکھا، دو ہینے ہو گئے ہیں۔ اب گھر آ جاؤ لیکن اوم نے دوسرے خط میں اس طرح جواب دیا۔ جیسے اُسے والدین صاحب کا خط ملا ہی نہیں، ایک دو بار ماں نے مجھے کہا

کہ اوم کو لکھو، کہ وہ آجائے، اتنی دیر پر اے گھر ٹھہرنا مناسب نہیں، میں نے ماں کو بتا دیا۔ کہ میں نے اوم کو جلد لوٹ آنے کے لیے لکھا ہے، لیکن میں نے اوم کو کوئی خط نہ لکھا، کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ اگر اوم گھر آنا چاہتا ہے، تو اپنی مرضی سے آئے، چھٹیاں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں، اور اگر چھٹیاں رانی کے ساتھ گزاری جائیں، تو اس میں کیا برائی ہے۔  
دو سال اور گزر گئے۔

ان دو سالوں میں نہ رانی آئی، اور نہ اوم ان کے گھر گیا۔ اب اوم جوان ہو گیا تھا۔ اس کا قد پہلے سے بھی دراز ہو گیا تھا۔ اگر اُس کے قد کے لمبائی کی یہی رفتار رہی، تو وہ ایک دن چھ فٹ کا جوان ہو گا۔ اُس کا چہرہ پہلے سے لمبوتر ہو گیا تھا، اور بائیں، لمبی لمبی، کچھ لنگھتی ہوئیں۔ جمولتی ہوئیں، آگے پیچھے بڑھ رہی تھیں، اُس کی باتوں میں اب پھر چڑچڑاؤ عود کر آیا تھا، گو وہ اب سمجھانے کے بعد چپ ہو جاتا تھا، لیکن اکثر وہ چلا کر ہی جواب دیتا تھا فلمیں بستور اُسی کثرت سے دیکھتا تھا، باتوں میں بلا کی شوخی وہ ہر شخص کا مذاق اُڑاتا، گھر پر کوئی مہمان آئے، اُس کا

مذاق اڑانے سے کبھی نہ چوکتا، چھوٹی بہن شیدا کو بہت ستاتا  
اُسے بہت پریشان کرتا تھا، رلاتا تھا، اور کبھی کبھی اُسے پیٹ  
کرتا تھا، یونہی ایک ہلکی سی چپت، اور شیدا بسورتی ہوتی لہا  
کے پاس جا کر شکایت کرتی، ”مجھے اوم نے پیٹا ہے۔“ اور ماں  
کہتی۔ ”تم نے اوم کو چھیڑا ہوگا۔“ اور اوم چختا، چلاتا ماں  
کے پاس چلا جاتا، اور پھر کہتا، ”دیکھو ماں میں شیدا کو کتنی  
بار کہہ چکا ہوں کہ میری کتاب پر کچھ نہ لکھا کرو۔ لیکن یہ چوبی  
ہمیشہ کچھ نہ کچھ میری کتاب پر لکھ دیتی ہے، اور پھر مجھے پرہاتی  
ہے۔ اور آج میں نے ایک ہکا سا تھپڑ مارا۔ تو اس نے سارے  
گھر میں کہرام مچا دیا، اور ماں شیدا کو جھڑکتی، اور کہتی ”بڑے  
بھائی کا ادب کرنا چاہئے۔ اور اوم یہ جواب سن کر بیمنہ  
پھیلاتا ہوا، بازوؤں کو ہوا میں اچھالتا ہوا باہر نکل آتا۔ مجھے  
ان باتوں کو دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ میں ماں سے کہتا، ”کتاب  
نے اوم کو بالکل بگاڑ دیا ہے، اب بچہ تو نہیں، جو اس کی  
شرارتوں کو نظر انداز کیا جائے، اب تو وہ مجھے گھورتا ہے،  
اور کہتا ہے، کہ میں تم سے لبا ہو گیا ہوں۔ اور سینے کو  
پھیلا کر بلند آواز میں باتیں کرتا ہے، اسے رتی بھر شرم

نہیں آتی، چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں، اس سال میٹرک کا امتحان دے گا، آپ ہی سوچیے، ایسے شریر باتوئی لڑکے کو کون کالج میں داخل کرے گا۔ ماں یہ باتیں سن کر چُپ ہو جاتیں، اور میری باتوں کو نظر انداز کر دیتیں، اور میں دل ہی دل میں کڑھتا، اور اوم کو کوستا، اور اخیر میں مجھے خاموش ہونا پڑتا۔

ایک ابرآلود شام کا ذکر ہے، ماں نے مجھے بتایا کہ رانی چند روز کے لیے یہاں آرہی ہے، رانی کی آمد کی خبر سن کر میں چوکتا ہو گیا۔  
اور پھر رانی آئی۔

اُس رانی اور اس رانی میں فرق تھا تین سال کے بعد میں رانی واقعی رانی بن گئی تھی، اب وہ سرگوشیاہ انداز میں باتیں نہ کرتی، وہ دبی دبی منسی، وہ شرکیں آنکھیں، اب ستر نہ آئیں تھیں، اُس کے اُٹھنے بیٹھنے میں ایک بختلگی سی آگئی تھی، اُس کے من میں ایک نئی دلاویزی تھی۔ گو وہ بچپن ہی سے کافی خوبصورت تھی، لیکن اس تھوڑے سے

عرصے ہی میں اُس کا خفتہ حسن و جمال بیدار ہو چکا تھا۔ اُس کی جلد صاف اور شفاف، جیسے سمندر کی جھاگ، رخساروں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی، آنکھوں میں آسمان کی نیلاہٹ، کمر میں بے پناہ لچک، اور اُس کے نتھننے میں وہ سونے کی تیلی، کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور بند گلے والی قمیض جس پر سبز رنگ کے ٹن لگے ہوئے تھے، اُس کے سینے پر کتنے خوشنما لگتے تھے اور کانوں میں سفید آویزے، جو سرخ کانوں کو چھوتے ہوئے نرم لچک دار گردن پر جھللا رہے تھے اُس کا قد یوکلپٹس کے درخت کی طرح لانا۔ اُس کی آواز میں اُٹھتے ہوئے شباب کی موسیقی۔ اور جسم پر طرح طرح کے رنگوں نے ایک نئی کیفیت پیدا کر دی تھی، سفید آویزے۔ سبز ٹن۔ پیازی ڈوپٹہ، لبوں پر شفق کی لالی، سپید سپید گردن پر نیلی رگ پھرتی ہوئی، ان تمام رنگوں کے امتزاج نے رانی کو ایک برفانی پرندے رت گلے کی طرح خوبصورت بنا دیا تھا، اور وہ اوم کی طرف دیکھتی، اور مسکرا دیتی، جیسے وہ اوم سے کہہ رہی ہے۔ دیکھنا نا۔ اب بتاؤ، اب کیا کہنا چاہتے ہو، تمہارے خاندان میں کوئی ایسی خوبصورت لڑکی

ہے، میں تمہارے خاندان کی سب لڑکیاں دیکھ چکی ہوں، سب بھدی، بدصورت اور بد شکل ہیں، کیوں، میاں، اپنی صورت شیشے میں دیکھی ہے، کتنے لمبے ہوتے جا رہے ہو، چھوٹا سا چہرہ، اور کپڑے کتنے بھونڈے سے پہنے ہوئے ہیں، اگر شکل اچھی نہیں، تو کپڑے اچھے پہنا کرو۔ اور پھر تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔ موٹی، کزت، کوے کی سی آواز، کیا آج کل بھی منجھے چلاتے رہتے ہو۔

اوم رانی کی طرف دیکھتا، اور رانی کے محسن کا جائزہ لیتا، شاید اوم کو اپنی بدصورتی کا احساس ہو گیا تھا یا یوں سمجھیے، کہ رانی کے حسن نے اُس کے تخیل کو چکا چوندا کر دیا تھا۔ اب جب وہ رانی سے ملتا، تو وہ بجھا بجھا سا رہتا، کچھ کھویا، کھویا سا۔ بالکل اُسی دیے کی طرح جس میں تیل تھوڑا سا رہ گیا ہو، وہ جانتا تھا۔ کہ رانی کو اپنے حُسن کا ضرورت سے زیادہ احساس ہے، لیکن اس احساس کے متعلق وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا، کہ رانی اُسی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرے، رانی اُسی طرح فرمائش کرے۔ اُسی طرح نہ گومتیاں کرے، اُسی طرح اُس پر حکم کرے۔

اسی طرح اُسے کہے جاؤ، کھٹے چنے لے آؤ، ملائی کی برف لاؤ،  
 کاپیاں ختم ہو گئی ہیں، مجھے سائیکل پر چڑھنا سکھاؤ، اور وہ  
 چاہتا تھا۔ کہ رانی اُسی طرح اُس کے کان میں آہستہ آہستہ  
 باتیں کرے۔ رانی کی گرم گرم سانس اُس کے کان سے ٹکرائے  
 اُس کی ہلکی ہلکی ہنسی پھر اُس کے کانوں سے مس ہو، وہ  
 موسیقیت سے بھری ہوئی آواز اُس کے دل کے پردوں کو  
 ایک بار پھر جھنجھنا دے۔ لیکن اب تو بات ہی اور تھی، اگر  
 رانی کرسی پر بیٹھتی تو وہ صوفے پر بیٹھ جاتا، اور کتاب لیکر  
 پڑھنے لگتا، اوریوں محسوس کرتا کہ ابھی رانی کرسی سے  
 اٹھ کر اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ جائے گی اور پوچھے گی  
 کونسی کتاب پڑھ رہے ہو، اور وہ چیخ کر کہے گا، کہ تو پڑھ  
 بڑی حسین بنی پھرتی ہو، لیکن کتاب سے نظر اٹھا کر جب وہ  
 رانی کی طرف دیکھتا، تو رانی کو سینڈل کے تسمے ٹھیک کر کے  
 بوئے پاتا۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ اگر کوئی نواچے وہ  
 مکان کے پاس سے گزرتا، تو وہ اس بات کا اتھار کر مارہتا  
 کہ ابھی رانی کچھ کھانے کے لیے کہے گی، اور وہ دوڑ کر نواچنے  
 والے کو بلائے گا، اور رانی کو کھٹے چنے کھلائے گا۔ اور اسی طرح

سوچتے سوچتے وہ کتاب کے دو تین صفحے پڑھ جاتا۔ اور جب آنکھ اٹھا کر دیکھتا، تو رانی کو ماں سے باتیں کرتے ہوئے پاتا۔ تو وہ غصے سے جل بھن جاتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا۔ بڑی کیسی ہے۔ اگر رانی اُسے اکیلی مل جائے، تو وہ اُسے پیٹے۔ کہ وہ دوبارہ اس گھر کی طرف کبھی رُخ نہ کرے۔

اس کے بعد میں نے کبھی دونوں کو کبھی اکٹھے نہ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں کے درمیان کوئی آہنی دیوار حایل ہے۔ جس کو وہ پار نہیں کر سکتے، رانی شیلہ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی، اُسے چھیڑتی، اُس سے مذاق کرتی، ماں کو طرح طرح کے دلچسپ لطیفے سناتی، اسکول کے اُتانیوں کے متعلق نقلیں کر کے گھروالوں کو ہنساتی۔ اور ماں تو کہتی تھیں، کہ ان تین سالوں میں رانی کی کایا پلٹ گئی ہے، اب تو بڑھیں بڑوں کے کان کھرتی ہے، اور کسی کو بات تک نہیں کرنے دیتی۔ لیکن اوم کے آنے پر وہ چپ ہو جاتی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی فوق الفطرت انسان اُس کی طرف آرہا ہے۔ اور یکایک اُس کا گلا دبوچ لے گا۔ وہ فوراً سہم جاتی۔ جیسے پرندہ کسی شکاری کو دیکھ کر

سہم جاتا ہے، اور پھر نیم باز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی اور کبھی کبھی مسکرا دیتی، اور پھر فرش کی طرف دیکھنے لگتی۔ یا کبھی کبھی قمیض کے بٹن درست کرنے لگتی۔ یہ مسکراہٹ کس لیے تھی۔ وہ کیوں اوم سے ڈرتی تھی، اور جب اوم گھر میں نہ ہوتا تو اُس کے چہرے پر بشاشت آجاتی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ اُس کی باتوں میں روانی آجاتی۔ اس کی حرکات میں خود اعتمادی کی جھلک نمایاں ہو جاتی، لیکن اوم کے وارد ہونے پر وہ کچھ گھٹی گھٹی سی رہ جاتی تھی۔

چھ مہینے اور گزر گئے، رانی کے والد کا خط آیا۔ کہ رانی کی شادی ہو رہی ہے، اُن دنوں گھر میں سے کوئی بھی شادی پر نہ جاسکتا تھا۔ ماں اور والد بیمار تھے، اور مجھے چھٹی نہ مل سکتی تھی، صرف اوم جاسکتا تھا۔ لیکن اوم نے شادی پر جانے سے انکار کر دیا۔ اوم نے صاف کہا، دیا، کہ اس کا سالانہ امتحان قریب آگیا ہے۔ اس لیے وہ شادی پر نہ جاسکے گا۔

رانی کی شادی ہو گئی۔

رانی کے والد نے بہت گلا کیا۔ اور خط پر خط لکھے کہ آپ نے اچھا نہیں کیا، آپ میں سے کوئی بھی میری بیٹی کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ برسوں کے تعلقات پر آپ نے پانی پھیر دیا۔ اور سوا باتوں کا ذکر کیا۔ جو ان موقعوں پر لکھی جاتی ہیں۔ والد صاحب اکثر اوم پر ہی اپنا غصہ نکالتے اور کہتے یہ سب اوم کی شہرت ہے۔ اگر وہ شادی پر چلا جاتا تو کیا ہرج تھا۔ بڑا ضدی ہے، اتنی ضد بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر ہم میں سے رانی کی شادی پر کوئی نہیں گیا۔ تو اوم کی شادی پر کون آئیگا یہ تو رشتے کی باتیں ہوتی ہیں۔ آج کل کے لڑکوں کو ان رشتوں سے کیا واسطہ، انھیں کیا معلوم۔ کہ دوستی کس طرح نبھائی جاتی ہے، رشتہ داروں سے کس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ بس کالج کا چکر لگا لیا۔ اور بیہودہ فلمیں دیکھ لیں، اور وقت ضائع کرتے رہیں۔

پھر رانی ایک سال کے بعد ہمارے گھر آئی، رانی اب بھی خوبصورت تھی۔ بھڑکیلے کپڑوں نے اسے زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا، ہاتھوں پر سونے کی چوڑیاں تھیں، اس نے بند گلے کی قمیض پہنی تھی، اور سر پر سبز رنگ کا دوپٹہ تھا، جس کی

تیلابہٹ اُس کی آنکھوں سے ملتی تھی جوڑے میں گلاب کا پھول  
 لگا ہوا تھا۔ قد و خال میں وہی تیکھا پن تھا خاک میں ابھی تک سونے کی  
 تلی چمک رہی تھی، لیکن رانی پہلے سے کچھ گدرا گئی تھی۔

اوم کہاں ہے۔ رانی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈرائنگ روم میں ہوگا۔ ماں نے کہا۔

رانی کی نگاہیں ڈرائنگ روم کی طرف مرا گئیں،

”اچھا تو میں اوم سے مل آؤں“ وہ ڈرائنگ روم کی طرف جانے  
 کے لئے اٹھی۔

یہیں بیٹھو۔ میں اسے بلاتی ہوں اور ماں نے میری

طرف دیکھا۔ اور میں ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ اوم ہونے پر بیٹھا ہوا تھا۔

تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔

میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اوم نے سگریٹ کا

دعوں نکلتے ہوئے کہا۔

”رانی تمہیں بلاتی ہے۔“

میں اسے تانگے سے اترتے دیکھ چکا ہوں۔ اوم

جیب میں سے رومال نکال کر پیشانی پونچھنے لگا۔ ”وہ تمہیں اندر

بلاتی ہے۔“

اوم چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اور پھر اوم نے دبی آواز میں کہا۔ میں اُس سے نہیں مل سکتا۔

پاگل نہ بنو۔

”اس میں پاگل پن کی کون سی بات ہے؟“ اُس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ یوں —“ اور میں

خاموش ہو گیا۔

اوم فرش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں کی اڑیاں بل رہی تھیں اور انگوٹھے کو دانتوں کے نیچے رکھے ہوئے ناخن کاٹ رہا تھا۔

اُس بیچاری کا کیا قصور تھا۔

تو کیا قصور میرا ہی ہے۔ اوم نے قہر آلود نظروں

سے میری طرف دیکھا۔

کون کہتا ہے تمہارا قصور ہے، کم از کم رانی سے

مل تو لو۔

رانی کو کہہ دیجیے کہ وہ گھر میں نہیں ہے، اور وہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرے میں تیزی سے چلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ  
بھینچے ہوئے تھے۔

میں وہاں سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں گیا  
جہاں رانی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔ رانی نے میری طرف دیکھا۔ شہر  
ایک لمحہ کے لیے اُن آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک دکھائی۔ اور  
پھر رانی کہنے لگی۔ ”اوم نہیں آیا۔“

”اوم گھر میں نہیں ہے؟“ میں نے گلوگہ آواز میں کہا۔  
رانی نے گردن کو ایک طرف جھٹک دیا۔ شاید  
میری بھرائی ہوئی آواز نے اوم کے پیغام کو رانی تک پہنچا دیا تھا  
رانی کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئیں، آنسوؤں کے دو قطرے  
سونے کی چمکتی ہوئی چوڑیوں پر گرے، اور پھیل کر سپید سپید جلد  
میں جذب ہو گئے۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ اوم سہر  
ننگا تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا گلی کے آخری حصے تک پہنچ چکا تھا۔

---

میرنی آواز

---



پران نے مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا۔ ”بھئی کسی دن آؤ، آج کل میری بیوی گانا سیکھ رہی ہے۔ میں نے بیوی کو گانا سکھانے کے لیے ایک ماسٹر رکھا ہے۔ تم دیکھو تو یہی کہ ٹریننگ اچھی مل رہی ہے یا نہیں، تم خود ایک اچھے گویے ہو مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اس وقت تو صرف ہاں کہنے کے سوا اور کچھ کہہ نہ سکا لیکن بعد میں یہ سوچ کر تذبذب میں پڑ گیا کہ میرے دوست کو یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ میں گویا ہوں اور بہت اچھا گاتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں علم موسیقی سے قطعی بے بہرہ ہوں، اور مجھے گانا نہیں آتا یوں تو ہر شخص

گا سکتا ہے، اور گاتا ہے، لیکن وہ گانا جس سے روح کو حال آجائے اور انسان ایک نئی مسرت سے ہم کنار ہو جائے اس سے کوسوں دور ہوں۔ میری آواز بھدی اور بھاری ہے اس میں موسیقیت رتی بھر نہیں، ہو سکتا ہے کہ پران نے مجھے ایام طفلی میں گاتے سنا ہو لیکن اس بات کو آج بیس برس ہو گئے ہیں اور اس دوران میں دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب مجھے بچپن کا زمانہ آریوں کے زمانے کی طرح پرانا معلوم ہوتا ہے، اور پھر اس مسلسل بھوک اور بیکاری نے میری روح میرے جسم اور میری آرزو کا بری طرح کچھ مر نکال دیا ہے۔ جب میں گفتگو کرتا ہوں۔ تو گمان ہوتا ہے۔ گویا کوئی مردہ قبر سے بول رہا ہے۔ گو مجھے موسیقی سے کافی دلچسپی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں جب تک انسان کا پیٹ خالی ہے۔ وہ کسی بات سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانے کی چیرہ دستیوں نے مجھے اس بری طرح روندنا ہے کہ مجھے گانے اور رونے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

میں اپنے دوست کے گھر کبھی نہ جاتا۔ اگر میں نے سپلائی کے دفتر میں نوکری کے لیے درخواست نہ دی ہوتی

آج کل سپلائی کے دفتر میں ہر شخص کو نوکری مل جاتی ہے۔ جنگ کا زمانہ ہے اور اس جنگی دور میں کوئی گریجویٹ بیکہ نہیں رہ سکتا۔ نئی دہلی میں یہ مثل مشہور ہے۔ کہ جس شخص کو آج کل نوکری نہیں ملتی اُسے قیامت تک نہ مل سکے گی۔ نئے سپلائی کے دفتر میں درخواست دیے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے لیکن ابھی تک انٹرویو کا انتظار کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں گریجویٹ نہیں کیا میں انسان نہیں ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ اگر ہر شخص کو نوکری مل جائے۔ تو بھوک، بیکاری اور مفلسی کدھر جائیں گی۔ اور اگر بھوک، بیکاری نہ رہے۔ تو یہ نظام حکومت نہ رہے۔ یہ سیاست نہ رہے۔ اخلاق کی قدریں اور ہوں گی۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ سماجی نظام کو بدلنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں، اس لیے ان باتوں کو مد نظر رکھ کر میں اپنے دوست کے گھر چلا گیا۔ چونکہ وہ سپلائی کے دفتر میں نوکر ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ پران سے اپنی نوکری کے متعلق چند باتیں پوچھوں گا۔ اور بھائی کا گانا بھی سنوں گا جب میں اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ تو وہ حجت بنولنے جا رہا تھا۔ وہ میرے بڑھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر بولا۔

”کیا حجامت بنوانے چلو گے۔“

”موافق کیجیے۔ پران صاحب، میں حجامت

بنوانے نہیں آیا، میں بھابی کا گانا سننے آیا ہوں۔“ اچھا۔  
میں بنوالوں۔ تم گانا سنو، تمھاری بھابی ابھی آتی ہی ہو گی۔  
یہ کبہ کرو چل دیا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں صرف ایک  
ہی کرسی تھی۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کی وجہ سے جسم پسینے  
سے شرابور تھا۔ کاش بجلی کا پنکھا ہوتا لیکن اس دور ابتلا  
میں ایک کلرک سے بجلی کے پنکھے کی توقع نہ ہو سکتی تھی  
میں نے جیب سے رومال نکالا اور چہرے کا پسینہ پونچھنے  
لگا۔ اتنے میں ایک صاحب اندر آئے۔ اور نہایت بے تکلفی  
سے چٹائی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

”بہن جی کدھر ہیں۔“

”مجھے تو معلوم نہیں۔“

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ اور ایک  
دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔  
”کیا آپ ہی گانا سکھاتے ہیں۔“ میں نے  
مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں“۔ اور وہ مسکرانے لگے۔ پھر وہ ہنس پڑے۔ اور اپنے نیلے دانتوں کو نمائش کے لیے پیش کیا یا سوا اس کے کہ یہ ابھی اپنے دانتوں کو نمائش کے لیے پیش کرتا۔ اور کیا کر سکتا تھا۔ ماسٹر صاحب کہنے لگے۔ آپ کون ہیں۔ کہاں نوکر ہیں۔ کیوں آئے ہیں۔ کیسے آئے اور کب آئے ان کے سوالات کو سن کر میں کچھ گجبر گیا۔ لیکن پھر دل کو ڈھارس دیتے ہوئے بولا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں کہاں رہتے ہیں۔ اور کیوں رہتے ہیں۔ میرا جواب سن کر ڈھونڈ پ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ مسکرانے لگا۔ شاید مسکرانے کے سوائے اور کچھ نہ آتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی شکل نہایت ہنؤڈی تھی چہرے پر موسیقیت نام کو نہ تھی یہاں نحوست اور سنجاست برستی تھی۔ دانت اور مسڈر سے پان کھا کھا کر میلے اور گندے ہو گئے تھے۔ چہرے کے خدو خال بری طرح مسخ ہو گئے تھے۔ اور جب کبھی وہ قہقہہ لگاتے تو چہرے کی ہنؤڈت عجیب ہو جاتی تھی۔ جب باتیں کرتے تھے تو چہرے پر بے شمار شکنیں پڑ جاتیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ موسیقی کی دیوی نے اچھی طرح بدلہ لیا ہے۔ کہنے لگے ”آج کل ٹیوشنوں کا بہت زور ہے

کھانا کھانے کے لیے وقت نہیں ملتا۔  
 جی ہاں ٹھیک ہے آپ صاف کیوں نہیں کہتے  
 کہ کھانا ہی نہیں ملتا۔

”باوصاحب موسیقی نہایت ہی اچھی چیز ہے  
 لیکن راگ و دیا کو سکھانے کے لیے ایک بات کا خاص خیال  
 رکھنا چاہیے۔“

”وہ کیا۔“ میں نے چونکا کر کہا۔

”راگ سکھانے والے کا چال چلن اچھا ہونا  
 چاہیے۔ باوصاحب! اس نے اپنے خشک اور باسی لبوں  
 پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مسکرانے لگے۔ میں اس کے  
 چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ تاکہ اس کے چہرے کا اچھی طرح  
 جائزہ لے سکوں۔ ماسٹر صاحب کے گال اندر دھنس چکے  
 تھے۔ اور پیشانی پر بہت سی جھڑیاں تھیں۔ آنکھوں کے نیچے  
 سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور لبوں پر ایک سیاہی پائل  
 پیڑی جمی ہوئی تھی۔ اس کے حلیے سے صاف عیاں تھا کہ  
 وہ ساری عمر کوٹھوں کی سیر کرتا رہا ہے۔ اور اب جب کہ زندگی  
 کا سرمایہ لٹ چکا ہے۔ تو اس نے گویوں کے لئے یہ سنہری

اصول گھڑ لیا ہے۔ مجھے اس اصول سے خاص دل چسپی نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے۔ موسیقی اور تجربہ — یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ ابھی یہ باتیں میرے دماغ میں گشت کر رہی تھیں کہ دوست کی بیوی آگئی۔ ایک ہندوستانی عورت کی طرح کچھ کچھ شرماتی۔ لہجاتی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئی، وہ ابھی ہاتھ روم سے نہا دھو کر نکلی تھی، سر کے بال گیلے تھے۔ اس نے سفید سارھی باندھی تھیں جس پر زرد رنگ کا کنارہ لگا ہوا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہ تھی۔ لیکن بدصورت بھی نہیں کہ اُسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کی شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ شادی سے پہلے کافی خوبصورت ہوگی اور مجھے اپنے دوست کی بات یاد آگئی۔ کہ وہ کس طرح شملہ کی صاف شفاف سڑکوں پر اپنی ہونے والی بیوی کا تعاقب کرتا۔ اکثر سڑکوں پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ وہ اس کے لائے لائے بالوں کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد یہ سیاہ بال اس کی ملکیت ہوں گے۔ یہ موٹی موٹی آنکھیں جن پر سیاہ پلکیں جھکی ہوئی ہیں چند ہسینوں کے بعد صرف اُس کی طرف

دیکھا کریں گی۔ لیکن شادی کے بعد کیا ہوا کلرک کے بے رحم ہاتھوں نے حسن کو بری طرح جھنجھوڑا۔ وہ دل کشی، وہ جاؤ بیتا وہ رعنائی، جاتی رہی۔ وہ مسکراہٹ جس کو دیکھ کر اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ آج بے جان اور بے کیف ہو گئی تھی۔ وہ نرم، ملائم، سرخ ہونٹ کہاں گئے۔ ان کی جگہ اب تیلے، سوکھے لبوں نے لے لی تھی اب وہ موٹی موٹی آنکھیں کچھ کچھ اُداس غمزہ انگین اور کھوئی کھوئی رہتی ہیں۔ چہرے کی چمک اور دلآویزی جاتی رہی، آوازیں نقابت اور کمزوری لیکن ان باتوں کے باوجود یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ زندگی میں دل کشی رہے اگر جہاں دل کشی معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ تو گانا سیکھ کر روح کے لیے نئی غذا تیار کی جائے لیکن مصنوعی غذا سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر میرا دوست یہ بھی سوچ رہا تھا۔ کہ اگر گانے کے ساتھ اسے ناچنا بھی آجائے تو خوب لطف رہے گا۔ وہ ایک اور ماسٹر کی تلاش میں تھا۔ جو اس کی بیوی کو ناچ سکھائے۔ گانا اور ناچ یہ دونوں چیزیں متوسط طبقے کی لڑکیوں کے لیے لازمی قرار دی گئی ہیں دونوں فن اپنی اپنی جگہ نہایت عمدہ اور موزوں ہیں۔ اور

ان دونوں کو سیکھنے کے لیے وقت چاہیے وقت اور روپیہ ایک لاکھ کے پاس اتنا روپیہ کہاں اگر پیٹ کاٹ کر ان چیزوں سے حفظ اٹھایا جائے تو اس کے نتائج نہایت خوفناک ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ میرے دوست کو گانے اور ناچ سے خاص رغبت ہو، ہو سکتا ہے میرے دوست کی بیوی کو گانا سیکھنے کا خاص شوق ہو کہیں وہ حالات کہاں وہ ماحول کہاں اگر مبع سے لیکر شام تک گھر کا کام کاج کیا جائے برتن صاف کیے جائیں فرش دھویا جائے، روٹی پکائی جائے۔ بچوں کے کپڑے سے جائیں۔ تو پھر ناچ اور موسیقی کے لیے کہاں وقت مل سکتا ہے اور اگر وقت مل سکتا ہے تو اتنی سکت کہاں ہوتی ہے۔

اور یہی حال ہماری بھابی کا تھا۔ ماسٹر صاحب نے ہارمونیم اُن کی طرف کر دیا۔ اور بھابی نے ہارمونیم پر انگلیاں پھیرنی شروع کیں اور ماسٹر صاحب نے گانا شروع کیا اور پھر آہستہ آہستہ بھابی نے شرماتے ہوئے اپنے زرد لب کھولے اور ماسٹر کی آواز میں اپنی آواز ڈھکیل دی اور پھر دونوں آوازیاں کمرے میں گونجنے لگیں ہم تینوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا

ہو رہا ہے تینوں نر مختلف تھے، نہ بھابی کے گلے کے نر باجے سے ہم آہنگ تھے۔ اور نہ ماسٹر کی آواز باجے سے ملتی تھی۔ اور طرہ یہ کہ جب تینوں آوازیں اکٹھی نکلتیں تو میں یہ سوچنے لگتا کہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے۔ رونا کہاں شروع ہوتا ہے۔

آخر میں نے شور و غل سے تنگ آ کر کہا: "آہستہ گانے"

ماسٹر صاحب!

وہ میری طرف دیکھنے لگا اور پھر مکرانے لگا آپ نے دانتوں کے ساتھ مسوڑھے بھی نمائش کے لیے پیش کیے میلے دانت پہلے ہی کیا کم تھے۔ مسوڑھوں کی نمائش نے تو مجھے بالکل برا لگنے لگا کر دیا اور اب تو یہ حالت تھی کہ ارد گرد کے مکاناتوں سے لڑکیاں باہر نکل کر میرے دوست کے دروازے پر آگئی تھیں اور نہایت اشتیاق سے اس انوکھی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ماسٹر صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر گارہے تھے۔ اور بھابی کا سانس پھول گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار تھے۔ اور ہونٹ اس ورزش کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ اگر بھابی کا سانس پھول نہ جاتا تو موسیقی تاقیامت جاری رہتی وہ تو ہانپ کر چپ ہو گئی لیکن ماسٹر صاحب نے منہم بجاتے رہے۔ اور میری طرف اس طرح دیکھتے رہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ صاحب ابھی تک آپ نے ایک تعریفی جملہ بھی نہیں کہا۔

لتنے میں پران بھی آگیا۔ اور مجھے کچھ ڈھارس ہوئی۔ وہ حجامت کرا کے آیا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ حجامت اس کی نہیں ہوئی بلکہ میری ہوئی ہے۔

”سناؤ بھائی تمہارا کیا سارا“ اس نے میرے کندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”بہت اچھا کیا بتاؤں ماسٹر صاحب بھی کیا کہوں آج آپ نے کمال کر دیا“ اور پھر ماسٹر صاحب چلا اٹھے ارے یہ کیا دیکھا تو ان کی شلوار بھیک گئی تھی۔ ارے پانی کہاں سے آیا۔ پران نے چونک کر کہا۔

”صبح فرش دھویا تھا شاید کچھ پانی رہ گیا ہو“ اور بھابی ہنسنے لگی اور پھر جم چاروں نے کیا رگی قہقہہ لگایا۔ جب ماسٹر صاحب چلے گئے تو پران کہنے لگا ”سناؤ یا تمہاری کیا رائے ہے۔ بھابی کی آواز کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اور ماسٹر کی قابلیت کے متعلق“

میں کچھ عرصہ خاموش رہا اور اپنے دوست کے خیال پر غور کرتا رہا۔ اگر میں صاف گوئی سے کام لوں تو میرے دوست کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور اگر ماسٹر صاحب کے خلاف کچھ کہوں تو بیچارہ بھوکا مر جائے گا۔ میں نے بھابی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا ہو گیا تھا۔ اور چہرے کی رگیں ابھر آئی تھیں اس کے گال کچھ اندر پچک رہے تھے اور

آنکھوں کے گرد سلوٹیں پڑ رہی تھیں اور میں نے دل میں سوچا کہ بھابی کونہ تو موسیقی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناچ کی انھیں تو اچھی خاصی مقوی خدا مانی چاہیے۔ اگر صبح و شام تازہ پھل ملیں تو حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ اگر بھابی پھل کھانے لگیں تو ماسٹر صاحب کیا کھائیں گے۔

”بھئی بتاؤ۔ تو سہی میری بیوی کیسا گاتی ہے۔“ پر ان

نے بچوں کی طرح منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اب اس کے سوا کہ میں اپنے دوست کی بیوی کے گمانے کی تعریف کرتا اور کیا کر سکتا تھا۔ میں نے جی کھول کر بھابی کے گلے کی تعریف کی اور ماسٹر کی قابلیت کے پل باندھ دیے میرا دوتا میری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے اُس کے سامنے تان سین یا باجو باوریا بیٹھا ہوا ہوا اور پچھ مسکرا کر اپنی بیوی کے رد چہرے کی طرف دیکھنے لگا تعریف کے چند جملوں نے بھابی کے چہرے پر ایک۔ مرغ لہری زندہ کر دی تھی لیکن بھوک اور نقاہت کی وجہ سے اس کے ہونٹ کا نپ رہ رہتے۔ وہ کبھی کبھی آیا کرو۔ اور بھابی کا گانا سنا کرو۔ پر ان نے کہا میں نے سر ہلادیا اور اٹھکھٹا ہوا۔ آج کل میں سوچتا رہتا ہوں۔ کہ اپنے دوست کو کس طرح کہوں کہ اس کی بیوی کو موسیقی کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ

وٹامن کی —

---

کاش و بیوقوفان

---



وہ خود نہیں جانتا تھا۔ کہ اُس میں کس بات کی کمی تھی۔ وہ کیوں ایک غلط راستے پر کئی برسوں سے گامزن ہے، اگر اُسے اس بات کا احساس ہوتا۔ کہ وہ ایک غلط راستے پر چل رہا ہے تو وہ ضرور اپنے اطوار بدل لیتا۔ اکثر اس کی ماں نے اُسے کو سنا تھا۔ کہ وہ ایک خاموش، بے حس، بے جان سا لڑکا ہے، اُس کی بول چال میں عورت کا سا شرمیل پن ہے وہ کیوں ایک گوشے میں ایک نئی نویلی دلہن کی طرح خاموش پڑا رہتا ہے۔ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے زندگی میں حرکت کی ضرورت ہے۔ وہ لوگوں سے کیوں نہیں ملتا، آخر کب تک اُس کے والدین اُس کی مدد کریں گے۔ وہ اکثر ماں کی

گھڑکیوں کو سنا۔ اور چپ ہو جاتا۔ اور ماں اپنی باتوں کا جواب نہ پا کر خوب کڑھتی۔ اور چیخ چلا کر سمجھ لیتی۔ کہ لڑکا بیوقوف ہے۔ شاید اس کا ذہن ناکارہ ہے، شاید وہ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن وہ اپنی ماں کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ وہ لوگوں سے کیوں نہیں ملتا، اُسے لوگوں سے مل کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوتی، اور وہ اکثر خاموش رہتا، وہ جانتا تھا۔ کہ اس خاموشی کے خول کو توڑ کر وہ بے محور ہو کر رہ جائیگا۔ یہی اُس کی قلم و تھی، اگر اُس نے اس قلم و کو بھی ربا د کر دیا۔ تو اُس کے پاس کیا رہے گا۔ اُسے محسوس ہوا۔ جیسے اس خاموشی سے اسے محبت ہے، اتنی محبت جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ماں کو اس خاموشی کے متعلق کچھ بتا دے، تو کیا وہ ان باتوں کو سمجھ جائے گی۔ جب کبھی وہ اکیلا ہوتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ خاموشی اپنی نرم انگلیوں سے اُس کے سر کے بالوں کو سہلا رہی ہے۔ وہ بستر پر ایک بے جان بت کی طرح بیٹھا رہتا، اور خاموشی کی ان گنت گہرائیوں میں گھومتا اُس وقت اُسے کتنی مسرت حاصل ہوتی، جیسے خوشیوں کا منبع اعظم اور مسرت کی لہریں اُس کی رگ رگ میں سما رہی ہیں

وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتا۔ اور آنے والے واقعات سے بے رخی کا اظہار کرتا۔ کمرے میں اکیلا پڑا رہتا۔ خاموشی اُس کے چاروں طرف رینگتی اوپر نیچے، دائیں بائیں اور کتنا ہی عرصہ اس سردی نشہ میں گزر جاتا۔ اور جب وہ آنکھیں کھولتا تو کمرے میں کبھیوں کے بھنبھانے کی آواز آتی۔ وہ گردن کے نیچے سے ہاتھ نکالتا اور لوہے کی چارپائی پر ہاتھ رکھ دیتا۔ گرم گرم ہاتھ جب لوہے کی سردیٹی پر پڑتے تو اُس کی آنکھیں سردی اور ٹھنڈک سے کھل جاتیں، وہ ایک جھانی لیتا، اور ٹانگیں پھیلا کر بستر پر دراز ہو جاتا، لیکن آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور اُس کی نظریں روشندان کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے گزر کر باہر کی فضا میں گھوم جاتیں، وہ اس چھوٹے سے جھروکے سے بیرونی زندگی کا انازہ لگا سکتا تھا۔ وہ اس سوراخ سے بہزیتوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جن پر سورج کی کرنیں رقصاں تھیں، وہ آسمان اُس نیلے حصے کو دیکھ سکتا تھا۔ جو پتوں کی اوٹ میں نہ تھا۔ ہرے ہرے پتے کسی دہقانہ لڑکی کی طرح آنکھ مچول کرتے، لیکن اُس کے ساتھ ہی ایک گلا سڑا پتا اُس کی طرف جھانک کر دیکھتا، اُسے اس گلے سڑے پتے کو دیکھ ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ پتا اُس کی

زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے، پھر ہوا کا تیز جھونکا آتا اور یہ گلاسٹرا پتیا سبز پتوں کی اوٹ میں آجاتا، اور کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ گلاسٹرا پتیا ٹہنی سے الگ ہو گیا ہے، اُس کے گرنے کی آواز اس کے کانوں میں آتی، اور اس کے سارے وجود میں ایک جھجھکی سی آجاتی، لیکن جلد ہی کسی کے کدال چلانے کی آواز آتی، تو اُس کا ذہن اس کی آواز کی طرف منعطف ہو جاتا۔

دو دن سے مزدور کدال چلا رہا تھا۔ اور اس نے مکان کے ارد گرد کی گھاس کو صاف کر دیا تھا۔ صبح ہوتے مزدور اُس کے پاس آیا تھا۔ اور اُس نے اپنا کام دکھانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ واقعی زمین پر گھاس کا نام و نشان نہ تھا، لیکن اب زمین زیادہ گندی اور بھٹی معلوم ہوتی تھی۔ جگہ جگہ گھاس کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نہایت بد نما دکھائی دیتے تھے، کیا گھاس کلٹنے سے مکھیاں کم ہو جائیں گی! اُس نے سوچا۔ اور مزدور کی طرف دیکھنے لگا جیسے اُس سے جواب طلب کرنا چاہتا ہے۔ مزدور اُس کی طرف جیران نظروں سے دیکھنے لگا۔ دراصل وہ اپنے کام کی داد چاہتا تھا۔ اُس نے دو دن میں کتنا کام کیا تھا۔ اُس نے مزدور

سے پوچھا ”چائے پیو گے؟“ مزدور نے جواب دیا ”چائے“ اُس نے حسین کو آواز دی، اور کہا۔ کہ ”مزدور کو چائے پلاؤ“ اُس نے سوچا وہ انسان ہے، اُسے انسانوں سے ہمدردی ہے۔ لیکن مزدور نے حسین کا نام سنتے ہی چائے پینے سے انکار کر دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مسلمان کے گھر کی چائے نہیں پیتا۔ لیکن وہ تو خود بھی ہندو ہے۔ اُس نے سوچا ”تو کیا ہوا بابو جی، آپ کا باورچی تو مسلمان ہے۔“ وہ غصے سے لال بولا ہو گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا۔ کہ اس مزدور کو دھکے دے کر مکان سے باہر نکال دے، کدال لے کر اس کے سر کو چیرنے اتنی غریبی کے باوجود اوہام کی رگیں ابھی تک تروتازہ ہیں کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا۔ شاید اُس کی باتیں کوئی سمجھی نہیں سمجھ سکتا۔ اُس نے سوچا۔ خاموشی ان باتوں کی بہترین دوا ہے۔ لیکن اس خاموشی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اُس کی ماں نے اُسے کو سنا تھا۔ وہ کیوں چپ سا رہتا ہے، بالکل ایک گدھ کی طرح، جو درخت کی اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر فضائی تنہائیوں میں کھویا رہتا ہے، وہ لوگوں سے باتیں کیوں نہیں کرتا۔ کیا مزدور انسان نہیں ہوتے، اُس نے اس مزدور سے باتیں

کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مزدور کا جواب سن کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ اُن پڑھوں سے مل کر کچھ حاصل نہیں۔ مزدوروں کو روز چاروں میں بیٹھ کر انسان کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

اس کی ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی ”تم نوکروں سے بہت پیار کرتے ہو۔ یہ چھوٹے لوگ بہت کینے ہوتے ہیں بڑوں میں بیٹھ کر آدمی بڑا آدمی بنتا ہے۔ بیٹا اس شرمیلے پن کو چھوڑ ڈیڑوں سے فنا سیکھو! وہ ان باتوں کو سن کر گھبرا جاتا۔ دور سے خاموشی کی نرم نرم لہریں اُس کی طرف بڑھتی تھیں، اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتیں اور وہ بستر پر بے سکت اور بے جان پیکر گر پڑتا۔

آج اُس کا بھائی اُسے کہہ رہا تھا ”ایسے کام نہیں چلے گا۔ آخر کب تک میں تمہاری مدد کروں گا۔ ماں باپ کی باتوں کو تم نے رد کر دیا۔ اور تم نے اپنی زندگی سنبھالنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ تمہاری کالج کی زندگی اتنی نکستی اور ناقابلِ بیان ہے کہ اس کا دوہرا نامیری اپنی تک ہے۔ تم ایف۔ اے میں دو بار فیل ہوئے اور بی۔ اے میں تین بار اور جب تم نے



نرم و نازک۔ اُس کی نظریں قالین کے ایک سرے سے پھسلتی ہوئی دوسرے سرے تک چلی گئیں، سرخ، سبز، نیلی پیلی اون۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسی قالین پر قوس قزح کے تمام رنگوں کا اجتماع ہو گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اون کے اُبھرے ہوئے دھاگوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور اپنے بھائی کی باتیں سنتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے بھائی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ کیا اُس کی خاموشی کا نول ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیگا اُس کا بھائی کہہ رہا تھا ”تم میری طرف نہیں دیکھتے؟ میں دن رات کام کرتا ہوں، صبح سے لیکر شام تک دفتر میں قلم لکھتا ہوں، رات کو ٹائپ کرتا ہوں۔ اور جو وقت بچتا ہے، وہ لڑکوں کو پڑھانے میں صرف کرتا ہوں۔ صرف یہی نہیں روزانہ اخباروں کے لئے مزاحیہ مضمون لکھتا ہوں۔ آخر اسی طرح تو میں بالائی آمدنی حاصل کرتا ہوں، اگر میں تمہاری طرح چپ بیٹھا رہتا۔ تو آج فاقے کرتا۔ اور ساتھ ہی تم بھی۔ لیکن تمہارے کان پر تو جوں تک نہیں ریگلتی۔“

بھائی نے اُس کی طرف دیکھا، جیسے وہ ان باتوں کا جواب چاہتا ہے، لیکن وہ خاموش تھا، اُس کا ایک ہاتھ قالین

پر تھا۔ جس کے لمس سے وہ محفوظ ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں  
لوٹے ہوئے روشندان سے باہر کی چیزوں کا جائزہ لے رہی  
تھیں، مکیاں بھنبھنا کر بجلی کے تار پر سو گئی تھیں، باہر درختوں  
کے پتوں پر بارش کے قطرے آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے۔  
سڑا گلا ہوا پیتا اور گل گیا تھا، اور ٹہنی سے جدا ہونا چاہتا تھا۔  
مزدور کدال چلا رہا تھا۔ کبھی کبھی ساتھ والے مکانوں سے بچوں  
کے رونے کی آوازیں آتیں، یا کوئی نوجوان لڑکی کوئی فلمی گیت  
گاتی۔ تو وہ چونک پڑتا۔ مزدور کے کدال چلانے کی آواز برابر  
آتی رہتی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مزدور کام کرتا رہے گا۔ صبح  
سے لیکر شام تک، دور الارم کے بجنے کی آواز آئی، مزدور سنبھلا  
کام کرتا رہا۔ شاہدہ ساری عمر کام کرتا رہے گا۔ اور اُس کی  
زندگی کی کدال اسی طرح چلتی رہے گی۔

بھائی کا دوست کہنے لگا: ”میں نے بھی یہی محسوس

کیا ہے، کہ تم بہت خاموش رہتے ہو، آخر یہاں پڑے پڑے  
کیا کرتے ہو، کیا تمہارا جی اس کمرے سے نہیں اُگتا۔ آخر اس  
کمرے میں کیا ہے، آخر اس بستر میں کیا ہے، جو دن رات  
اس سے چھٹے پڑے رہتے ہو۔ اور جانے کیا کیا باتیں سوچتے

اگر زندگی میں کامیابی چاہتے ہو، تو کچھ کام کرو۔ میں کہتا ہوں  
 ریش کی طرف دیکھ لو۔ چند دن ہوئے یہاں آیا تھا۔ اُسے  
 کوئی بھی نہیں جانتا یہاں۔ اس کے باوجود وہ لوگوں سے ملنے  
 گیا۔ اگر ایک جگہ نوکری نہیں ملی، تو دوسری جگہ گیا۔ اور وہاں  
 سے نامراد آیا تو تیسری جگہ گیا۔ شیر علی کے گھر وہ دس بار گیا ہوگا  
 آخر وہ بھی تو تمھاری طرح ہی انسان ہے۔ اور پھر اتنی دوڑ  
 دھوپ کے بعد اُسے جگہ مل ہی گئی۔ راجندر کو دیکھ لو۔ شاید  
 میڈک پاس بھی نہیں بالکل ڈفر ہے ڈفر۔ لوگوں سے ملتا ہے  
 انھیں اپنی کہانیاں سناتا ہے، کیا ہوا کہ اُسے ابھی تک نوکری  
 نہیں ملی رجب علی نے اُس سے وعدہ کیا ہے، کہ وہ اُسے  
 اپنی کمین گاہ میں جگہ دے دیکھا :-

”وہ راجندر کی طرح بیوقوف نہیں ہے، ہاں“

وہ راجندر کی طرح ڈفر نہیں ہے۔ اُس نے دل میں سوچا یہی  
 الفاظ وہ اپنے بھائی سے کہنا چاہتا تھا، لیکن اُس کا گلا بھر گیا  
 ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوکھا مڑا پتا اُس کے گلے میں اٹک گیا  
 ہے، لیکن بھائی نے شاید یہ الفاظ سن لیے تھے۔

”کاش تم بھی بیوقوف ہوتے۔“ اُس کا بھائی

یہ کہہ کر دفتر کو چل دیا۔ وہ دیر تک اس فقرے پر غور کرتا رہا۔ اس فقرے میں زہر کی تلخی تھی، یہ الفاظ سننے ہی اُس کا دماغ چکر اگیا، اُس نے محسوس کیا کہ ساری زمین پر پھیر گھاس اُگ آئی ہے۔ مکھیاں کمرے میں پھیر بھنبھناتے لگی تھیں۔ اور مزدور زور زور سے کدال چلا رہا تھا۔ بچے چیخنے لگے تھے، اور لڑکی چیخ چیخ کر فلمی گیت گا رہی تھی۔ "میرے پریشور" اُس نے سوچا اُس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے، آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اُس نے آنسوؤں کو، پلکوں سے باہر نہ نکلنے دیا۔ وہ کچھ نہیں کہے گا، اُس نے سوچا۔ "وہ اُس خاموشی کے نول کو کبھی نہ توڑے گا۔ یہی اُس کی زندگی کا بھید ہے، وہ اُس راز کو کبھی افشا نہ ہونے دیکھا۔ لیکن بھائی کے فقرے نے اُسے بڑی طرح گھائل کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج خاموشی کا ہال ٹوٹ جائے گا۔ اور اُس کی زندگی کا آخری سہارا بھی اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اگر اُس کی محبوب خاموشی نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا، تو پھر وہ کیا کرے گا۔ کیا وہ واقعی نکمٹا ہی ہے، کیا اُس نے زندگی میں کوئی جدوجہد نہیں کی، کیا اُس نے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں سوچا، کبھی نہیں

سوچا! کیا اُس کی زندگی یونہی بیکار اور بے مصرف رہے گی!!

شاید یہ بات نہ تھی، اُس نے اس چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ جس کا علم اُس کے بھائی کو نہ تھا۔ اور وہ اپنے بھائی کو بتانا بھی تو نہ چاہتا تھا۔ ہاں یہ درست تھا۔ کہ وہ لوگوں سے بہت کم ملتا، اُن سے کم گفتگو کرتا، اکثر اُن کی باتوں کا ہاں یا نہ میں جواب دیتا، لیکن وہ لوگوں کی موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اُن کی ہر حرکت، ہر بات، کا تجزیہ کر سکتا تھا کہ فلاں آدمی نے اُسے کیوں دعوت دی، فلاں آدمی کیوں مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ فلاں اُس کے پاس روز کیوں آتا تھا، فلاں نے کیوں اُسے چائے پر بلایا۔ فلاں نے اُس کی سفارش کیوں نہ کی۔ یا فلاں نے اُسے آفس میں جگہ کیوں نہ دی، وہ انسانوں کی کمینگی سے کافی آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ قدم قدم پر زندگی کے ہر نقطے پر انسانی کمزوریوں کا احساس کر سکتا تھا۔ اور اگر آج اُس کے بھائی نے اُسے بیوقوف یا ڈفر کہہ دیا۔ تو وہ اس فقرے کے نفسیاتی پس منظر کو سمجھ سکتا تھا۔

آخر ان سالوں میں اُس نے کچھ تو سیکھا تھا۔ ان ستائیس سالوں میں اُس نے کیا سیکھا تھا۔ شاید اس کا جواب تھا خاموش رہنا، خاموشی کی لہریں پھر اُس کی طرف بڑھنے لگیں، اور آہستہ آہستہ پاؤں سے ہوتی ہوئی دماغ کی طرف سرک گئیں، لیکن آج ایک لفظ، بیوقوف نے اُس کے دماغ میں آگ سی بھردی تھی، برسوں کا سویا ہوا ذہن یکا یک جاگ اُٹھا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اُس نے زور سے قابِلین کے اُبھرے ہوئے اونی دھاگوں کو پکڑ کر روشندان سے جھانکنا چاہا۔ سبز سبز پتوں پر بارش کے قطرے یوں تیر رہے تھے، جیسے اُس کی پلکوں میں آنسو، زندگی آنسوؤں کی پھلجھڑی ہے، اُس نے سوچا، یہاں غم زیادہ ہے اور خوشی کم، کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آتا، اور پتوں کے پلنے سے نیلے آسمان کا ٹکڑا اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتا۔ ٹوٹے ہوئے روشندان سے سورج کی الوداعی شعاعیں لرزتی کانپتی اندر آتی گئیں۔ اُنھوں نے پہلے سامنے کی دیوار کو چوما۔ دیوار پر گلو ریا کی تصویر لٹک رہی تھی، کرنوں کے پڑتے ہی تصویر مسکرا اُٹھی، کرنیں آہستہ آہستہ میز کی طرف بڑھیں، پھر کتابوں پر گریزیں، کتاب کا ٹائٹل کرنوں کے

پڑتے ہی جگمگا اٹھا، میں نے سات عورتوں سے محبت کی،  
ٹائٹل بستر پر لیٹے ہوئے نوجوان کی طرف گھور کر دیکھنے لگا، کڑی  
مسکراتی ہوئی الماری کی طرف بڑھیں۔

یہ کرنی وینٹنگ کریم کے ڈبے سے آنکھ بھونپی  
کہیلنے لگیں۔ داستوں کا برش مسکرانے لگا۔ کرنی وہاں سے ہوتی  
ہوئی کیل سے ٹنگے ہوئے سرخ بلاؤز پر آ بیٹھیں، وہ بالکل اُس  
بچے کی طرح پیاری اور معصوم لگتی تھیں، جو ماں کی گود میں بیٹھے  
کر مے ہوئے باپ کی یاد دلاتا ہو۔ یہ بلاؤز گھوریا کا ہے، اُس  
نے سوچا۔ اُسے گھوریا سے محبت ہے، بالکل نہیں۔ بلکہ گھوریا  
اُسے چاہتی ہے! اُسے گھوریا سے محبت نہیں ہو سکتی، صرف  
پیار ہو سکتا ہے، ایک قسم کا اُس۔ یا یوں کہو، کہ گھوریا کو وہ  
پسند کرتا تھا۔ بالکل اُس سرخ نمکائی کی طرح، جو اُس نے ٹرنک  
میں چھپا رکھی تھی، لیکن اُس کے بھائی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ  
وہ گھوریا کو پسند کرتا ہے، اور گھوریا اُسے چاہتی ہے، اور جب  
کبھی وہ گھوریا کو خط لکھتا ہے، تو وہ فوراً آ جاتی ہے، اکثر وہ  
گھوریا کو ملنے جاتا تھا۔ اور اُسے یہ بار بار محسوس ہوتا تھا کہ  
گھوریا اُس کی بیوی ہے، گھوریا بالکل کنواری تھی مگر وہ بالکل

ایک ہندوستانی بیوی کی طرح اس کی خاطر مدارات کرتی تھی وہ روپیوں کا بٹوا گلوریا کے حوالے کر دیتا تھا۔ تاکہ گلوریا کو یہ محسوس ہو جائے، کہ اُسے گلوریا پر کتنا بھروسہ ہے، اور جب کبھی وہ باہر سیر کرنے جاتا، تو گلوریا ہمیشہ پانچ کا نوٹ اُسے دیتی، اور کہتی، ”بس اور نہیں ملیں گے“ وہ زیادہ روپیوں کے لئے چلاتا رہتا، گودل میں وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کہ زیادہ روپے یہاں خرچ نہ ہوں۔ تو اچھا ہی ہے۔

اگر اُس کے کپڑے مہلے ہو جاتے، تو گلوریا رات کو اُس کے کپڑے دھوتی، اُس کے بوٹوں کو پالش کرتی اُس کی بیٹی ہوئی تمیصوں کو سستی۔ ان میں مٹن دکاتی، اتنا۔ خیال تو اپنی بیوی بھی نہیں رکھتی اور گلوریا تو ایک کنواری عورت تھی، وہ صرف اُس سے محبت کرتی تھی، اور وہ اس کے بالوں سے کھیلتا تھا، اُس کے حین، گداز جسم کے اس سے لپٹے آپ کو محفوظ کرتا تھا، گلوریا کا سینہ کتنا۔ خوب صورت تھا۔ وہ اُسے پسند کرتا تھا، وہ بھی اُس کے پاس آتی تھی، اس کے ساتھ کئی کئی ہفتے رہتی تھی، وہ اُسے گالیاں دیتا تھا اور وہ گالیوں کی پروا نہ کرتی تھی، اُسے صرف

اس بات کا اندیشہ تھا، کہ کوئی اور لڑکی اُس کے عاشق سے محبت کرنے لگے، اس لئے گلوریانے اپنا نوکر اس کے گھر بھیج دیا تھا، اور جب کبھی گلوریانے اُس کے پاس آتی تو نوکر اکثر گلوریانے کو ادھر ادھر لے کر باہر لے جاتا، کہ فلاں دن صاحب نے تین عورتیں ملنگائی بخشیں۔ فلاں دن ایک لڑکی صاحب سے ملنے آئی تھی وہ یہ باتیں سن کر جل بھن جاتی، بگلی گلوریانے اُس سے ناراض ہو جاتی، وہ اُسے گالیاں سناتا اور خوب پیٹتا ”سالی مجھ پر اعتبار نہیں کرتی، نوکروں کی باتوں پر اعتبار کرتی ہے، بہت کہیں ہے تو، اس لئے تو میں تیرے ساتھ شادی نہیں کرتا“ اکثر گلوریانے سے شادی کے لئے کہا کرتی تھی، اور وہ اُس کی باتوں کو سن کر سکرادیتا ”خاموسی“ اُس نے سوچا ”ہر مرض کا بہترین علاج ہے۔“

جب کبھی وہ باہر جاتا تو اکیلا ہوتا مگر اکیلا ہو کر بھی وہ اکیلا نہ ہوتا۔ اُس وقت اس کی زندگی دو حصوں میں بٹ جاتی، اور وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا،

جاہل، بیوقوف۔ ہمیشہ بیوقوف اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، اُسے بچپن سے اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت تھی، اُسے یاد ہے کہ جب وہ پہلی یاد و مہری جماعت میں پڑھتا تھا، تو اسکول سے واپس آکر وہ ایک اجاڑ، ویران سی جگہ کا رُح کرتا، اور سنگ ریزوں کو اکٹھا کر کے اُن سے باتیں کرتا، کوئی اُس کا دوست بن جاتا، کوئی دشمن کسی کو مارتا، کسی کو پیار کرتا، اسی طرح شام ہو جاتی، اور اس کے والدین اس کی تلاش میں ادھر آ نکلتے، اُسے پنھروں سے گفتگو کرتے دیکھ خوب ہنستے، اور کہتے لڑکا پاگل ہے، بیوقوف ہے، اور اب جوان ہو کر بھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا، اپنی کمزوریوں پر نگاہ ڈالتا، اپنی اچھائیوں کا اندازہ لگاتا۔ اُس کا بھائی درست کہتا تھا، کہ اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ جب کبھی وہ اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا، تو وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا، جیسے وہ بالکل اکیلا ہے، وہ اُن لوگوں کی طرح گپیں نہ ہانک سکتا، وہ چپ چاپ اُن کی باتیں سنتا رہتا۔ حتیٰ کہ وہ اُس کی موجودگی کے احساس سے بے بہرہ ہو جاتے، وہ پھر زور سے

کھانتا، باپونہی روز سے فقہہ لگاتا۔ تاکہ اُس کے ساتھ جوں کے اُس کی موجودگی کا احساس ہو جائے۔

اُس کے دوست نہایت ہی عامیاناہ قسم کی باتیں کرتے۔ آج فلاں کلرک کی دس روپے ترقی ہوگئی ہے، اندر کے ہاں لڑکا ہوا ہے، بھئی گاندھی نہیں مرنے، نہیں تو ہندوستانیوں کو آزادی مل جاتی، ارے یار جناح پر فاطمہ نہ حملہ بھی ہوا اور بھیر بھی بیچ گیا۔ ہندوستانیوں کی قسمت میں غلامی لکھی ہوئی ہے۔ اتحادیوں کی حالت بہت نازک ہے، انھوں نے سسلی پر کوئی قبضہ نہیں کیا، یہ محض پروپگنڈا ہے، جرمنی نے ایسے خطرناک ہتھیار بنائے ہیں کہ اتحادیوں کے چھٹکے جھوٹ جائیں گے۔ جو گزرنے مسلمان نوکر رکھا ہوا ہے، بڑا ہندو بنا پھرتا ہے، سپلائی کے دفتر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے، ہندو تو ڈرپورک ہیں ڈرپورک۔ دیودت کی بیوی کے متعلق کچھ سنا۔ بڑی نبی ٹھٹھی رہتی ہے، یار چال غضب کی ہے، سینہ یوں ابھار کر چلتی ہے، کہ خدا کی پناہ، ارے اولکار کے ساتھ اُس کا تعلق ہے، خاوند بھی تو کچھ نہیں کہتا، لیکن تم کیوں جلتے ہو، بیوی اس کی ہے، اور وہ

اپنی بیوی کو جس طرح چاہے رکھے، جس کے ساتھ اس کی مرضی ہو وہ نیچھے گا۔ اس کا خاوند تو ایسا ہی ہے۔ یہ جنگ بھی ختم نہیں ہوتی، روپے کا دو سیر آٹا ملتا ہے۔ اور اگر جنگ ختم ہو گئی۔ تو تم پھر کیا کریں گے، روپے کا دو سیر آٹا بھی نہیں ملے گا، بناستی گھی اصلی گھی سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی باتیں، وہ دوستوں کی باتیں سننا رہتا اور خاموش رہتا۔

وہ بھائی کی ناراضی کا باعث بھی جانتا تھا، یہ محض اقتصادی الجھن تھی۔ اگر وہ ان کی جگہ ہوتا، تو پھر اسی طرح اپنے چھوٹے بھائی کو جھڑکتا، اکثر اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اسی طرح کو ساتھ، اس دنیا میں انسان اور کس پر غصہ نکالے، بڑا بھائی تو خن بجا نب تھا، وہ کئی برسوں سے ایک بڑے کنبے کو پال رہا تھا، وہ چاہتا تھا، کہ اس کا چھوٹا بھائی کہیں نوکر ہو جائے، تو کم از کم گھر کا نصف خرچ تو سنبھال لے، آخر وہ کب تک خون پانی ایک کر لے ان لوگوں کو کھلاتا رہے گا، اُسے بھی زندہ رہنا ہے، وہ بھی زندگی دیکھنا چاہتا ہے، جب سے اُس نے کمانا شروع کیا ہے، اُس کی آمدنی

کا بیشتر حصہ ان لوگوں پر صرف ہو جاتا ہے، اگر وہ صرف اکیلا ہوتا تو کس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا۔ محنت وہ کرے اور کھائیں دوسرے! اُس نے کہنے کو پالنے کا کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ بڑے بھائی کا غصہ جائز ہے، لیکن وہ بھی بیوقوف نہیں، اگر وہ بیوقوف ہوتا، تو کب کا نوکر ہو گیا ہوتا، اور اگر وہ نوکر ہو گیا ہوتا، تو اُسے ان باتوں کا کس طرح پتہ چلتا، اُس نے اس بیکاری کے زمانے میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ اور اب ماسوا خاموشی کے اُس کے پاس کچھ نہ تھا، یہی اُس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ آج اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا وہ چاہتا تھا، کہ اس خاموشی کے ہالے کو عینہ کے لئے توڑ دے اور اس روشندان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، تاکہ بیرونی منظر اُس کی آنکھوں میں سما جائے، وہ روشندان سے کود کر باہر نکل جائے گا۔ وہ بھائی سے چھپ کر بھاگ جائے گا، اس ماحول میں کتنا زہر ہے، اس کی زندگی میں کتنی تلخی ہے، اس کا سانس گھٹا جاتا تھا، اب وہ اس کمرے میں نہیں رہ سکتا، اب اُس کی روح کٹے کمرے

ہو چکے ہیں، وہ ضرور اس روشندان کو توڑ دے گا، اس نے پیچھا اٹھایا۔ اور روشندان پر دے مارا۔ روشندان کا شیشہ زیرہ زیرہ ہو گیا۔ ہرے ہرے پتے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ اور ہوا زور زور سے چلنے لگی، مزدور ابھی تک کدال چلا رہا تھا، سورج کی کرنوں سے پیچروں کے ٹکڑے چمک اٹھے تھے، اس نے ٹوٹے ہوئے روشندان سے اپنا ہاتھ باہر نکالا، ہوا اس کے ہاتھوں کو تھپکیاں دینے لگی اور اس کی انگلیوں سے سرسراتی ہوئی نکل گئی، اس نے سوچا، وہ محسوس کر سکتا ہے، ہوا اس کی انگلیوں سے مس ہو رہی تھی، لطیف نرم و نازک، بالکل گھوریا کے ریشمی بالوں کی طرح بالکل گھوریا کے ابھرے ہوئے سینہ کی طرح، بالکل گھوریا کے نازک، پتلے، سرخ، اور لذت سے چور لبوں کی طرح۔ وہ محبت کر سکتا ہے، وہ مزدور کے کدال چلانے کی آواز سن سکتا ہے۔ بگلی لڑکی ابھی تک گارہی ہے، وہی فلمی گیت — تارے ہیں میرے زخم جگر ان میں سما جا، وہ کین میں بھنے ہوئے گوشت کی

خوشبو سونگھ سکتا ہے، اس کے حواسِ خمسہ بالکل درست  
ہیں، وہ جو توف تو نہیں ہے — نہیں، نہیں وہ بالکل  
جو توف نہیں ہے۔

کاش جو وہ جو توف ہونا

